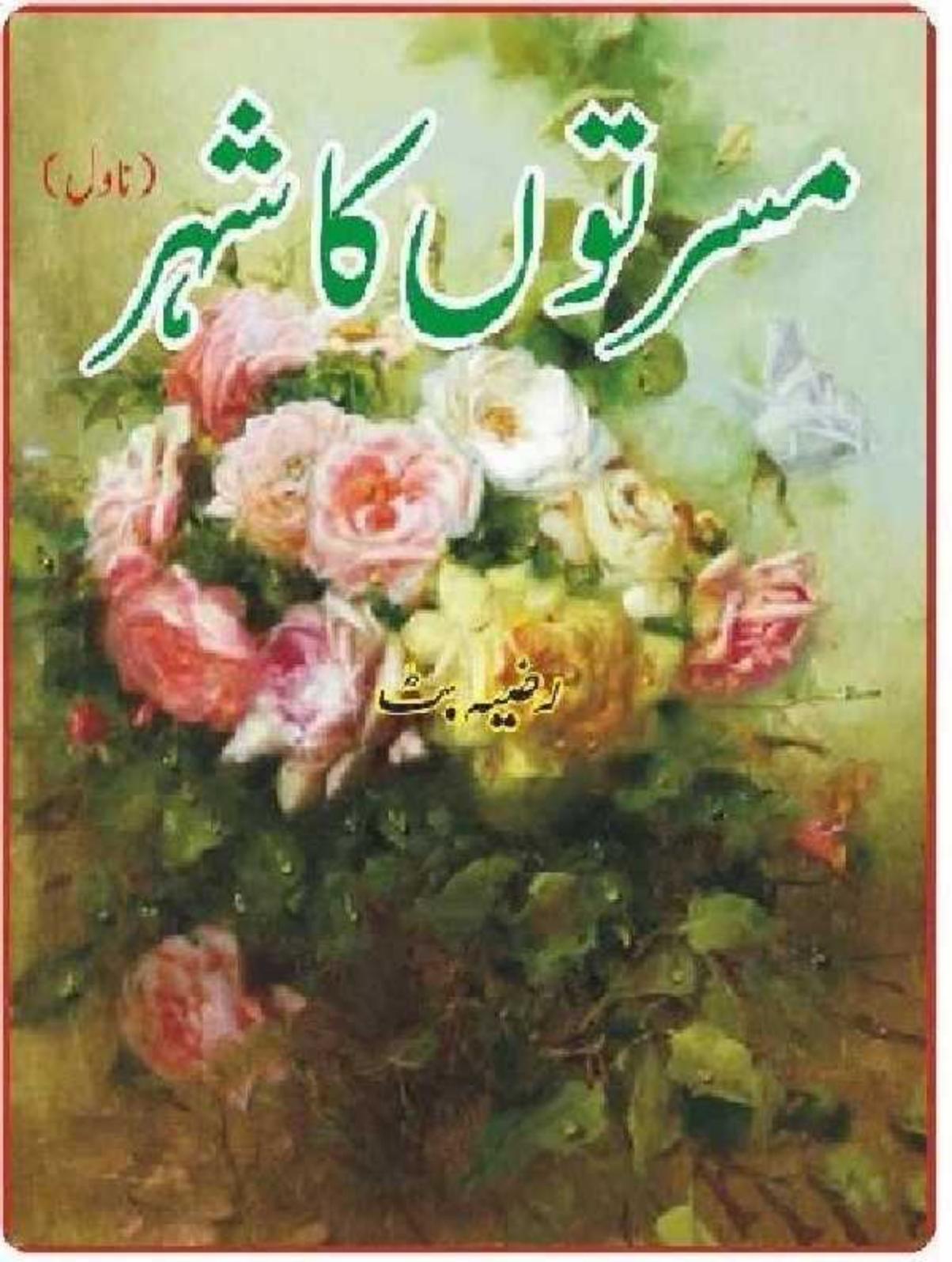


(ناول)

مسرتوں کا شہر

رضیہ بیگم



مسرتوں کا شہر

(ناول)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

رضیہ بیٹ

مسرتوں کا شہر

مدتیں گزریں شابلا اس کی پہاڑیوں کے دامن میں حارین نامی ایک خوبصورت شہر آباد تھا۔ اس شہر کے ایک طرف سرسبز پہاڑیوں کے سلسلے تھے۔ جو پھولوں اور پھلوں کے درختوں سے لدی رہتی تھیں دوسری طرف چنچل اور شوخ ندی تھی جس کا صاف شفاف پانی چاندی کی طرح چمکتا رہتا تھا..... شہر میں جگہ جگہ میدان بھی تھے۔ جن میں اگی سبز گھاس یوں لگتا قدرت نے بڑی نفاست سے قالین بچھا رکھے ہیں۔ پھولوں کے تختے ان میدانوں کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے اور جب ہوائیں سرسراتے ہوئے گزرتیں تو پھولوں اور پھلوں کی مہک ہر سو پھیل جاتی۔

یہاں چھوٹے بڑے کچے کچے مکانات بھی تھے۔ مکانوں کی سرخ اور سفید چھتیں جب سورج کی روشنی میں چمکتیں تو بے حد خوبصورت نظر آتیں۔ شہر کی سڑکیں پکی اور صاف ستھری تھیں۔

صدیوں تک یہ شہر خوبصورت اور آباد رہا۔ کیوں کہ اس شہر کے باسی بڑے ایماندار، جفاکش اور محنتی تھے۔ بھائی چارہ اور اخوت ان کا امتیازی نشان تھا۔ سب مل جل کر رہتے ایک دوسرے کی مدد میں پیش پیش ہوتے۔ کسی کو دکھ تکلیف نہ دیتے۔ بڑوں کی دیکھا دیکھی بچے بھی ایسا ہی کرتے ماں باپ کا ادب بزرگوں کا لحاظ اور خدمت کرتے کہنا ماننا ان کی فطرت تھا دل لگا کر محنت کرنا ان کا اشعار۔

لیکن جانے کیا ہوا کہ اس شہر کے باسیوں نے آہستہ آہستہ اپنے طور طریق بدلنا شروع کر دیئے۔ اچھائیوں سے روگردانی شروع کر دی اور برائیوں کو اپنانے لگے۔ امیر غریب چھوٹے بڑے سب ہی برائیوں میں مبتلا ہو گئے۔ ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے۔ غیبت کرتے۔ چغلی کھاتے۔ جھوٹ بولتے۔ ریا کاری کرتے۔ لڑائی جھگڑا معمول بن گیا۔ حق مانگنے کی بجائے حق چھیننے کو ترجیح دینے لگے۔ چوری چکاری عام ہو گئی۔ لوٹ مار سے کوئی نہ چوکتا۔ جس کے ہاتھ جو آتا اڑا لیتا محنت اور لگن سے کام کرنا جیسے کسی نے سیکھا ہی نہ تھا۔

بچے بھی بڑوں کی تقلید کرتے تھے۔ ساری برائیاں اور عیب ان میں بھی آ گئے تھے۔ نہ تو وہ ماں باپ کا کہنا مانتے نہ ہی کسی بزرگ کا ادب لحاظ کرتے۔ ماں باپ اپنی رنگ رلیوں میں کھوئے رہتے۔ بچوں کو تربیت کرنے کی انہیں فرصت ہی نہ تھی۔

جوشہ صدیوں سے شادو آباد اور پر رونق تھا نصف صدی ہی میں اس کا حال خراب ہو گیا۔ جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر نظر آتے۔ مکان ٹوٹ جاتے تو کوئی مرمت کی زحمت نہ کرتا۔ چونکہ لوگوں نے محنت کرنا چھوڑ دی تھی۔ اس لیے عام لوگ پہاڑیوں پر چڑھ جاتے اور درختوں سے پھل توڑ توڑ کر کھاتے۔ پھر آگ جلانے کے لیے انہوں نے درخت کا ثنا شروع کر دیئے کچھ ہی عرصے میں سرسبز پہاڑیاں نکلی ہو گئیں۔ پتھر ملی چٹانیں سی بن گئیں۔ کسی کسی جگہ پھلدار درختوں کے جھنڈرہ گئے۔ تو اس پر شہر کے امیر آدمی کشت یار نے قبضہ کر لیا۔ وہ بڑا ریا کاری اور جو رستم کا عادی تھا۔ رحم نامی جذبے سے آشنای نہ تھا۔ اسے جس چیز کی خواہش ہوتی وہ چھین لیتا کشت یار بڑا ظالم آدمی تھا۔ گوشہ کے تقریباً سبھی لوگ برائیوں میں مبتلا تھے۔ لیکن کشت یار سے سبھی ڈرتے تھے۔ اس کے ظلم کے آگے ٹھہر نہ سکتے۔ کیونکہ اس کا وار بھر پور ہوتا تھا..... چند لوگ جن کے دلوں میں خوف خدا باقی تھا۔ شہر میں رہتے تھے۔ لیکن ان کی زبانیں بھی بند تھیں۔ وہ ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کشت یار من مانی کرتا..... یہ لوگ بزدل اور ڈرپوک بن گئے تھے۔ کشت یار کے سامنے دم نہ مار سکتے یہی بات تھی کہ جب اس نے فارس کی بیوہ اور بچوں کو ان کے گھر سے نکال کر خود اس پر قبضہ کر لیا۔ وہ روئی، چینی چلائی لیکن کسی نے اس کی مدد نہ کی

کشت یار کے چند ساتھی اور بھی تھے۔ جو اسی کی طرح ظالم عیار و مکار تھے۔ دھوکہ دہی میں ان کی مثال نہ تھی

یہ تھے واسقہ اور مہیب..... ظالم و عیار ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے بد مزاج اور تند خو بھی تھے۔ گالیاں بکنا عادت تھی

مہیب کی ایک بہن صفحہ تھی۔ وہ بھی بڑی بد ماغ اور لڑاکا تھی۔ تساہل پسند تھی۔ دولت کی فروانی تھی۔ اس لیے پر تعیش زندگی گزار رہی تھی۔ اپنے نوکر نوکرانیوں پر زراذرا سی بات پر اتنا ظلم کرتی کہ آسمان لرز اٹھتا۔

موہین بھی ایک ایک درندہ صفت لڑکی تھی۔ کشت یار کی رشتہ دار تھی۔ اسی لیے وہ کشت یار کے نقش قدم پر چل رہی تھی۔

ایک دفعہ موہین اپنی رتھ گاڑی میں بیٹھ کر شہر کی سیر کو نکلی۔ اس نے بیش قیمت لباس پہن رکھا تھا۔ سفید گھوڑوں پر ریشمی چادریں تھیں۔ اور رتھ بان بڑی احتیاط سے رتھ چلا رہے تھے کہ اچانک سڑک پر عین درمیان میں ایک آدمی آ گیا۔ وہ غالباً اندھا تھا۔ کیونکہ اس نے ہاتھ میں چھڑی پکڑی ہوئی تھی اور سڑک کو چھڑی سے ٹٹول ٹٹول کر چل رہا تھا۔

رتھ بان گھوڑوں کی لگا میں ایک دم کھنچیں تو موہین کو ہلکا سا جھٹکا لگا.....

”کیوں کیا ہوا؟ رتھ کیوں روکی ہے“ وہ شیرنی کی طرح غرائی۔

رتھ بانوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”بولتے کیوں نہیں“ وہ چلائی۔ اور ہاتھ میں پکڑی چابک سے ایک رتھ بان کو پیٹ ڈالا۔

”دوسرا جان بچانے کی خاطر بولا“ مالکن سڑک پر شاید کوئی اندھا آدمی جا رہا ہے۔“ تو کیا ہوا۔ ایک اندھے کی خاطر مجھے جھٹکا دیا“ اس نے چابک ہوا میں لہرائی۔ دوسرے رتھ بان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جھٹ سے رتھ چلا دی۔ اندھا آدمی گھوڑے سے نکل کر اوندھے منہ گرا۔ لیکن موہین نے رتھ روکنے کی اجازت نہیں دی۔ رتھ بانوں سے بھی پرواہ نہ کی۔ اور تو اور چند راہ گیر بھی تھے۔ لیکن انہوں نے بھی آگے بڑھ کر ناپینا کو نہیں دیکھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر گیا ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ واسقہ نے بھی دو تین آدمی مروادئیے۔ اس کے محل کی بیرونی دیوار گر گئی تھی۔ جسے بنوانے کے لیے اس نے چند کاریگروں اور مزدوروں کو کام پہ لگایا۔ دیوار قدرے ٹیڑھی بنی۔ واسقہ نے جب ٹیڑھی دیوار دیکھی غصے سے بھر گیا اور اسی وقت اپنے ملازموں کو بلا کر دیوار گرانے کا حکم دیا اس نے دو تین مزدوروں کو بھی وہاں سے ہٹنے کی مہلت نہ دی اور وہ دیوار کے ٹپے آ کر مر گئے

ان بڑے اور امیر کبیر لوگوں کی دیکھا دیکھی عام لوگ بھی بے حس ہو گئے تھے۔ چوری اور نقب زنی میں تو ماہر ہو گئے تھے۔ لوٹ کھسوٹ کے بھی عادی بن گئے تھے۔ امیر غریب ایک ہی تھیلے کے چٹے بٹے تھے۔ شہر کی فضا ان لوگوں کے گناہوں سے بوجھل ہو گئی تھی۔ ندی کا صاف و شفاف پانی گدلا ہو گیا تھا..... اور نیلے چمکیلے آسمان پر لگا تار دھندسی چھائی رہتی ہے۔ لوگوں کو مطلقاً ان تبدیلیوں کا احساس نہیں تھا۔

لیکن

یہ تبدیلیاں بڑی واضح تھیں اور چشم پینا کو صاف طور پر نظر آ سکتی تھیں۔

چند بچے میدان میں کھیل رہے تھے۔ انہوں نے اپنے بستے پتھروں تلے رکھ دیئے تھے۔ مکتب جانے کی بجائے کھیل کود اور دھینگا مشتی کے لیے اس میدان میں آ گئے تھے۔ کچھ بچے تو کھیل کود کرواپس ہو لیے لیکن پانچ بچے وہیں کھیلتے رہے۔ ان میں شاتم رمیلہ اور فریدوں تین بہن بھائی تھے۔ گیر و اور سیہہ بھی بہن بھائی تھے۔ یہ شہر بھر کے بچوں میں سے سب سے زیادہ شرارتی بچے تھے۔ آوارہ گردی ان کا کام تھا۔ فریدوں اور گیر و کی عمریں لگ بھگ برابر تھیں۔ تیرہ چودہ سالہ یہ بچے شیطانی ذہن رکھتے تھے۔ شرارت کے منصوبے انہی کے ذہن کی پیداوار ہوتے۔ شاتم رمیلہ اور سیہہ ان کا ساتھ دیتے۔ ان بچوں کے ماں باپ بھی ان سے لاپرواہ تھے۔ انہوں نے ان سے کبھی باز پرس ہی نہ کی تھی کہ وہ سارا دن کہاں گزارتے ہیں۔ کھانا کہاں سے کھاتے ہیں۔ یہ مکتب

جاتے ہیں یا نہیں۔ اور گھر شام کو لوٹتے ہیں یا رات گئے

اور بچے چلے گئے تو یہ پانچوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے

”اب کچھ کرنا چاہیے“ فریدوں بولا۔

”ہاں تم سوچو نا کہ کیا کرنا چاہیے“ رمیلہ بولی۔

”ہاں بھئی..... ابھی تو بہت وقت پڑا ہے کچھ کرنا چاہیے“ گیرو نے بال کھجائے۔

”بھوک لگی ہے مجھے تو.....“ بارہ سالہ سیہ نے پیٹ میں ہاتھ گھسائے۔

”بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے“ تیرہ سال شاتم نے بھائی کی طرف دیکھا۔

”اچھا.....“ گیرو کچھ سوچنے لگا۔

”اس میں اتنی لمبی چوڑی سوچ کی کیا ضرورت ہے“ فریدوں تنک کر بولا۔ ”بھوک سب ہی کو لگی ہے۔ اس لیے اس کا بندوبست

ہونا چاہیے۔

”وہی تو سوچ رہا ہوں“ گیرو نے کہا۔

”آج تمہیں کوئی بات سوچنی نہیں رہی۔“ شاتم نے طنز سے کہا۔

”تو تم سوچ لو نا..... میں نے ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا“ گیرو غصے سے بھر گیا۔

”اے ہے اب لڑنے نہ لگ جانا۔ خواہ مخواہ وقت ضاؤ کرو گے۔ جلدی سے سوچو کہ ہم کیا کریں؟“

”میں نے سوچ لیا“ فریدو نے چٹکی بجائی

”کیا؟ کیا؟ بتاؤ نا“ شاتم رمیلہ اور سیہ جلدی سے کہہ اٹھیں۔

”ہونہہ..... سوچی ہوگی کوئی معمولی سی شرارت“ گیرو نے تمسخر سے کہا۔

”معمولی ہو یا غیر معمولی۔ پیٹ بھرنا ہے ہمیں بس..... بتاؤ فریدوں کیا کرنا ہے“

”بتاتا ہوں“ فریدوں نے تنک کر کہا۔

سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ تو وہ سینہ تان کر بولا۔ ”آج ہم قیصو کے ریزہ سے پھل چرائیں گے.....“

”ہونہہ.....“ گیرو نے ناک چڑھائی..... ”یہ کونسا معرکہ مارنا ہے.....“

”معرکہ تو ہے۔ قیصو آج کل ہم لوگوں سے بڑا محتاط رہتا ہے۔ اس کی ریزھی سے پھل اڑانا آسان نہیں۔“

”ہاں بھئی یہ بات تو ہے۔ اس کے ہتھے ہم میں سے کوئی بھی چڑھ گیا تو کھال ادھیڑ ڈالے گا۔“

”ہم کونسا ڈرنے والے ہیں۔“ فریدوں بولا..... ”پھل اڑانے کی ترکیب بھی سوچی ہے میں نے“

”بتاؤ نا..... کیسے پھل چرانے ہیں.....“ شاتم نے کہا۔

”ایسے کہ.....“ فریدوں بڑے معتبر انداز میں بولا۔ ”میں جا کر اس کی ریزھی کے قریب کھڑا ہو جاؤں گا۔“

”اور ہم سب“

”تم لوگ ان گھنے درختوں کے پیچھے چھپ جانا.....“

”وہ کیوں؟“

”وہ اس لیے..... کہ میں فوراً ہی قیصو کی ریزھی پر چھٹا ماروں گا..... ظاہر ہے مجھے پکڑنے کی کوشش کرے گا.....“

”ہاں وہ تو ہے۔“

”میں بھاگ لوں گا.....“

”ہوں“

”بس وہ میرے پیچھے لپکے گا..... اور تم سب ریزھی پر دھاوا بول دینا۔“

”ٹھیک بالکل ٹھیک۔“

”تو چلو..... سب ان گھنے درختوں کی طرف۔ پتہ نہ چلے قیصو کو۔ چھپ جاؤ جا کر“ فریدوں نے سب کو اشاروں سے چھپنے

کی جگہ بتائی۔

”شاتم اور ریمیلہ دائیں ہاتھ دے قدموں چل دیں گیر اور سپرہ۔ چپکے چپکے بائیں ہاتھ چل دیے تھوڑی ہی دیر میں وہ نظروں سے

اوجھل ہو گئے۔

اب فریدوں نے سڑک پر نگاہ دوڑائی۔ قیصو اپنی ریزھی لئے سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ اور دو تین عورتیں اس سے پھل خرید

رہی تھیں۔ پیسوں پر کوئی جھگڑا بھی ہو رہا تھا ایسے جھگڑے تو معمول کا حصہ تھے۔ اس لیے فریدوں نے اسے کوئی اہمیت نہ دی۔ اور لا

پردہ ہی سے سڑک پر چلنے لگا۔ سڑک پر ایک گدھا گاڑی جا رہی تھی۔ فریدوں نے ایک پتھر اٹھایا اور گدھے کی ٹانگوں پر کھینچ مارا۔

گدھے نے ڈھپوں ڈھپوں کرتے دہشتی جھاڑی، گاڑی الٹے الٹے پچی۔ گاڑی بان قلابازی کھا کر گرا۔ لیکن ہتھی کو پکڑ کر سنبھل گیا اس نے فریدوں کو بے نقط سنا ڈالیں۔ فریدوں قہقہے لگا تا بھاگ گیا۔

اے ”قیصو“ فریدوں نے اسے متوجہ کیا۔

فریدوں کو دیکھتے ہی قیصو نے گھبرا کر پیسے گلے میں ڈالے اور گلہ زبردستی کے نیچے چھپا کر تلخی سے بولا ”کیا ہے بے.....“

”پھل چاہئیں“

”پیسے ہیں“

”میں نے پھل مانگے ہیں۔“

چل چل راہ پکڑ اپنی..... آج پھلوں کو ہاتھ لگایا ہاتھ توڑ دوں گا۔ لحاظ کرنے کر نہیں..... پیسے ہیں تو بات کرو نہ راہ

پکڑ.....

”سوئے..... تیری عقل بھی تیری طرح موٹی ہے بک بک کئے جا رہا ہے۔ پھل دے مجھے۔“

”پیسے نکال.....“

”تو پیسوں کے پھل لایا ہے۔“

”تو..... تو..... تمہیں اس سے کیا.....“

”میں جانتا ہوں۔ کشت یار کے باغ سے چرا کر لاتا ہے تو پھل اور پیسے کھرے کر لیتا ہے.....“

”تم..... تم..... کون ہوتے ہو باز پرس کرنے والے..... میری مرضی جہاں سے لاؤں۔“

”اور میری بھی مرضی..... جیسے چاہوں پھل لوں.....“ کہتے ہوئے فریدوں نے جھپٹا مارا..... اور دو چار پھل اٹھا کر

دوڑ پڑا.....

”ٹھہر جا تو.....“ اس کی توقع کے عین مطابق قیصو چھڑی لے کر اس کے پیچھے لپکا۔

لیکن

ایک تو وہ موٹا تھا دوسرے عمر میں بھی فریدوں سے کئی سال بڑا تھا۔ غصے سے تاؤ کھانے کے باوجود فریدوں کو پکڑ نہ سکا۔

فریدوں نے بھاگتے ہی سیٹی بجادی تھی۔ جسے سنتے ہی اس کے ساتھی بچے ریزہ می پل پڑے تھے۔ اور پھل سے جھولیاں بھری

تھیں۔ پوری ٹیڑھی زمین لرالٹ دی تھی اور جو پھل اٹھائے نہ جاسکتے تھے انہیں پاؤں سے کچل ڈالا تھا۔

قیصو نے تھوڑی دیر تو فریدوں کا تعاقب کیا۔ لیکن فریدوں بھاگ کر درختوں میں غائب ہو گیا تھا..... ناچار ہانپتے ہانپتے قیصو

واپس پلٹا۔

اور

جو

اس نے پھل اور ریڑھی کا حال دیکھا۔

تو بے اختیارانہ چیختے ہوئے ادھر ادھر پاگلوں کی طرح دوڑنے لگا۔

کوئی بچہ اس کے ہاتھ نہ آیا۔

کیونکہ وہ سب تو ایک گھنے جھنڈ تلے بیٹھے اپنے سامنے لگے پھلوں کے ڈھیر سے پھل اٹھا اٹھا کر کھا رہے تھے۔

ساتھ ہی ساتھ وہ قیصو کا مذاق بھی اڑا رہے تھے۔ اور فریدوں کی ہمت کی داد بھی دے رہے تھے۔ آج کی کامیابی پر وہ سب

نازاں تھے۔

بادل نہیں تھے۔ پھر بھی فضا میں دھندلاہٹ تھی۔ آسمان صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ لگتا تھا دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا ہے۔ ایسی

کیفیت تو سال ہا سال سے تھی۔ لیکن ان دنوں دھندلاہٹ زیادہ ہی ہو رہی تھی۔ پہاڑیوں پر گھاس پھوس سوکھ گئی تھی۔ درختوں کے

پتے کالے پڑ گئے تھے۔ پھول بدوضع سے نظر آتے تھے۔ اور بہت سے پھلوں میں کیرے پڑ گئے تھے۔

کشت یار صعب اور مہیب شاندار مندوں پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے خوبصورت اور قیمتی لباس زیب تن کر رکھے تھے۔ فرش پر

قیمتی قالین پڑے تھے۔ اور سونے چاندی کے ظروف میں کھانے پینے کی اشیاء رکھتی تھیں۔ جنہیں ان کے ملازم باری باری انہیں پیش

کر رہے تھے۔ تینوں آج محسوس کر رہے تھے کہ پھلوں کی مٹھاس بد مزہ ہے۔ اور مشروبات بھی پینے سے دل خراب ہوتا ہے۔ یہ سب

کشت یار کے مندوں سے سچے ہال میں بیٹھے تھے۔

منقش پیالہ صعب نے منہ سے لگاتے ہی واپس رکھ دیا۔

”کیوں بھئی“ کشت یار نے پوچھا۔ ”مشروب پسند نہیں آیا“

”آج پتہ نہیں کیا بات ہے۔ یا تو میرے منہ کا ذائقہ خراب ہے۔ یا پھر شربت۔“

صحف بولی۔ اس نے خوبصورت دستی رومال سے اپنا منہ صاف کیا۔

”تم ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے بھی یہ بد مزہ لگا ہے“ مہیب نے کہا۔

”یہ پھل بھی کچھ اچھے نہیں“ کشت یار بولا..... ”جانے کیا بات ہے۔ پھل میرے ہی باغات سے آئے ہیں“

واسقہ کل بتا رہا تھا کہ اس کے باغ کے پھلوں میں کیڑے پڑ گئے ہیں۔“

بھئی یہی بات میں کہنے آئی تھی..... ”کچھلے مخرابی در سے اندر آتے ہوئے نازک اندام موہین بولی۔

سب نے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن اٹھ کر کسی نے اس کو تعظیم نہیں دی۔ نہ ہی موہین نے برا منایا اپنا خوبصورت لیس دار ڈریس سمیٹتے ہوئے وہ ایک کرسی پر خود ہی بیٹھ گئی۔

”تم کیا کہنے آئی تھیں..... موہین!“ صفح نے ناک منہ چڑھاتے ہوئے اسے دیکھا۔

”واسقہ کے پھلوں میں کیڑے پڑ گئے“ وہ بیزاری سے بولی۔

”کہیں ان پھلوں میں بھی کیڑے نہ ہوں“ مہیب نے ملازم کے ہاتھ میں پکڑی طشتری سے ایک تازہ پھل اٹھایا۔

”اوہ.....“ اس نے پھل کاٹتے ہی واپس پھینکا“ کیڑوں سے بھرا ہے۔ کوئی نہ کھائے۔

”یہ پھل.....“

”واقعی“ کشت یار کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

”خود دیکھ لو.....“

”اگر ایسا ہے تو بری بات ہے اس کا کیا کریں گے“

”یہ تو ہم نہیں جانتے.....“ مہیب بولا..... ”لیکن ہے واقعہ بری بات“

”بری بات تو فضا کی تبدیلی بھی ہے۔ کیا تم لوگوں نے محسوس نہیں کیا کہ آسمان لگتا ہے ہر وقت کالے بادل چھائے رہتے

ہوں.....“ موہین بیزاری سے بولی ”مجھے تو دھیرے سے وحشت ہوتی ہے.....“

”مجھے خود.....“ صفح نے کہا۔ ”میں بھی یہ تبدیلی محسوس کر رہی ہوں۔“

”اور پہاڑیوں کے پتھر بھی کالے ہوتے جا رہے ہیں۔ سبزہ چل رہا ہے اور پھول خوشنما نہیں رہے.....“

”ہاں ندی۔ ندی کا پانی بھی روز بروز گدلا ہوتا جا رہا ہے“

”لیکن وجہ؟“

”کیا پتہ.....“

وہ باتیں کر رہے تھے کہ واسقہ بھی آ گیا۔ اس نے بیش قیمت لباس پہن رکھا تھا اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت مٹلیں ڈبہ تھا۔

”واسقہ بھی آ گیا“ کشت یار بولا..... ”بھی تمہارے بغیر محفل سونی تھی۔“ ”اچھا.....“ واسقہ بولا ”محفل کو سجانے کے

لیے تو صفحہ اور موہین ہی تھیں۔ لیکن کیا بات ہے آج یہ دونوں کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔ چہروں پر ہر روز والی رونق نہیں۔ پھر وہ

تسخرے سے موہین کو دیکھ کر بولا ”بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوگی۔ بھی اے تو مسند پر ہونا چاہیے تھا۔ جہاں تساہل سے یہ لیٹ سکتی۔“

”دیکھو واسقہ“ موہین بولی۔

”ہوں“

”میں آرام پسند ضرور ہوں..... لیکن.....“

”لیکن کیا؟“

”اس وقت ہم فضا اور شہر میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی باتیں کر رہے ہیں حیران کن بھی ہیں اور پریشان کن بھی.....“

واسقہ متفکر نظر آنے لگا..... ”میں بھی انہی کے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔ میں کچھ لوگوں سے سنا ہے کہ گائے بھینسوں اور بکریوں

نے دودھ بھی کم دینا شروع کر دیا.....“

”ہاں..... کشت یار جلدی سے بولا ”میرے ملازموں نے یہ بات مجھ سے کہی ہے۔ لیکن میں نے سنی ان سنی کر دی تھی“

مہیب فکر مندی سے بولا۔ ”کچھ لوگ فصلوں کی باتیں کر رہے تھے کہ اس دفعہ فصلیں جل رہی ہیں۔ گندم کے سٹے خالی ہیں۔ ان

میں خال خال دانے ہی ہیں۔

سب فکر مند سے نظر آنے لگے جس محفل کچھ بے مزہ ہونے لگی۔ صفحہ تک کر بولی ”اس میں اتنی فکر مندی کی کیا بات ہے۔ ہم

لوگ دولت مند ہیں۔ ہمارے پہ سب کچھ ہے..... فصلیں جل گئیں تو ہمیں کیا فرق پڑے گا۔ بھوکا تھوڑا ہی مر جائیں گے“

”خیر بھوکا مرنے والی بات تو نہیں۔ لیکن یہ تبدیلی.....“

”تبدیلی..... اچانک ہی کسی نے کشت یار کی بات کاٹی۔ آواز اتنی گومجار تھی کہ سب نے اس سمت دیکھا جس سمت سے

آواز آئی تھی۔

”ہال کے مغربی در میں سفید بے داغ لباس والا ایک معزز انسان کھڑا تھا۔ اس کے سر کے بال اور داڑھی بھی سفید تھی۔ وہ اتنا پر وقار مقدس اور پر نور نظر آ رہا تھا کہ سب اسے دیکھتے ہی اپنی اپنی جگہ پر اٹھ کھڑے ہو گئے۔ حالانکہ یہ ان امیر زادوں کا نہ طریقہ تھا نہ دستور۔ وہ کبھی کسی کو اپنے سے زیادہ معتبر نہ سمجھتے تھے نہ ہی عزت دیتے تھے۔

لیکن

اجنبی میں جانے کیا بات نظر آئی کہ سب تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اور مزید عزت دینے کو سینوں پر ہاتھ رکھ کر سر قدرے خم کر دیئے تھے۔

اجنبی نے وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ سے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”آپ کون ہیں..... کشت یار نے بیٹھنے سے پہلے پوچھا۔

”ہم نے آپ کو اس شہر میں پہلے نہیں دیکھا“ یہ مہیب کی آواز تھی۔

”کسی دوسرے شہر سے آئے ہیں..... موہن کرسی میں سہل پسندی سے بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ہاں بیٹی..... میں دوسرے شہر ہی سے آیا ہوں“ وہ بزرگ متانت سے بولا۔

وہ بزرگ آگے برہا اور اپنی لاشی کے سہارے ان سب کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”ہمارے شہر میں باہر سے کبھی کبھار ہی لوگ آتے ہیں“ صنف بولی ”یقیناً آپ کوئی حاجت مند ہیں جو کشت یار کے ہاں چلے

آئے

”لیکن کشت یار کسی کی مدد نہیں کرتا.....“ واسقہ بولا۔

”تم کونسا کسی کی مدد کرتے ہو“ کشت یار غصے سے بولا۔

”تم آپس میں جھگڑو نہیں.....“ اجنبی نے کہا ”میں حاجت مند ہوں نہ ضرورت مند.....“

”تو پھر تم یہاں کیوں آئے ہو“ صنف بدتمیزی سے بولی

اجنبی بری متانت سے مسکرایا۔

پھر

..... بولا

”اس شہر کے آسمان پر دھومیں کے بادل چھائے رہتے ہیں۔ یہ بادل اب دبیز ہو رہے ہیں.....“

”ہاں یہ ہم بھی جانتے ہیں.....“

”تم لوگ نہیں جانتے کہ ایسا کیوں ہے.....“

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ واقعی وہ نہیں جانتے تھے کہ ایسا کیوں ہے

”تم ہمیں بتا سکتے ہو کہ ایسا کیوں سب نے پوچھا۔“

”اسی لیے تو میں یہاں آیا ہوں.....“

”تم کس شہر میں رہتے ہو.....“

”مسرتوں کے شہر میں“

”مسرتوں کے شہر میں“ سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”ہاں..... مسرتوں کے شہر میں.....“

”کیا تمہارا شہر ہمارے شہر سے زیادہ اچھا ہے.....“

”بہت زیادہ“

”سب نے ایک دوسرے کی طرف پھر دیکھا..... اجنبی نے بڑے تحمل سے کہا ”کہ زمانے میں تمہارا یہ شہر بھی بہت خوبصورت

تھا۔ یہ بھی مسرتوں کے شہر ہی کی طرح تھا لیکن اب ایسا نہیں ہے۔“

”ہاں ہم نے بھی سن رکھا ہے کہ صدیوں تک یہ شہر بے حد خوبصورت تھا۔“ کشت یار بولا۔

”لیکن اب تو.....“

وہ چپ ہو گیا تو واسقہ فکر مندی سے بولا۔ ”اب ہمارا شہر بہت خراب ہوتا جا رہا ہے۔ آسمان روشن نہیں رہا۔ فصلیں تباہ ہو رہی ہیں

..... ندی کا پانی گدلا ہو گیا ہے مہیب نے ہاں میں ہاں ملائی اور بولا ”تشویش کن بات تو یہ ہے کہ بھینسوں، گایوں اور بکریوں نے

دودھ کم دینا شروع کر دیا ہے.....“

”جانتے ہو یہ سب کیوں ہو رہا ہے“ اجنبی نے پوچھا

”جانتے ہوتے تو تم سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی.....“ صدف نے ناک چڑھا کر کہا۔

”آپ جانتے ہیں“ کشت یار نے صدف کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... اور یہی بتانے یہاں آیا ہوں.....“ اجنبی نے کہا۔

واسقہ جلدی سے اٹھا اور اجنبی کو ایک مسند پر بٹھاتے ہوئے بولا ”بتائیے۔ کیا وجہ ہے۔ ہم سب سوچ سوچ کر پریشان ہو رہے

تھے۔“

”اجنبی اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر نور پھیلا تھا۔ وہ معمر تھا۔ لیکن جسم تو مند تھا۔ وہ بڑے تحمل سے باتیں کرتا تھا۔

بڑے پیار سے سمجھاتا تھا۔ اور بڑے خلوص سے نصیحتیں کرتا تھا۔

سب اس کی طرف متوجہ تھے۔

اور

وہ انہیں

ان کے شہر کی بربادی کی وجوہات تفصیل سے بتا رہا تھا۔

وہ صاحب کرامات بزرگ تھا۔ سب مسحور سے نظر آ رہے تھے۔

”آج بوڑھی سہالی کو تنگ کرنے کا مزہ آ گیا۔“

”خوب گالیاں بک رہی تھی“

”ہمارا گالیوں سے کیا بگڑا“

”منہ کے بل گری خوب“

”بھئی میں نے ٹھوکر لگنے کے لیے پتھر ہی اس طرح جمائے تھے“

”تم نے نہیں میں نے.....“

”ترکیب تو میں نے ہی بتائی تھی نا.....“

”لیکن گری تو میرے پتھر جمانے سے.....“

”ماتھے پہ چوٹ آئی ہے اسے“

”کیا فکر ہے..... کونسا ہم تک پہنچ پائے گی۔ دو قدم ٹھیک سے تو چل نہیں سکتی وہ“

”بوڑھی ہے نا.....“

”اس میں ہمارا قصور ہے بھلا.....“

”پر خیر مزہ بڑا آیا..... کھانے کی چیزیں ہاتھ لگیں“

”پراٹھا مزے کا تھا.....“

”اور آلو.....“

”ہاں وہ بیٹھے خمیرے پکوان تو بہت ہی مزے کے تھے۔“

”اے ہے۔ خود تھوڑا ہی بناتی ہے۔ پیسے ہیں اس کے پاس۔ بازار سے خرید لاتی ہوگی۔“

”چرا لاتی ہوگی۔ ہمارے شہر میں پیسے دے کر چیزیں خریدنے والے چند بے وقوف ہی ہیں.....“

”یہ بات تو ہے..... چوری چکاری عام ہے۔“

”اسی لیے تو کوئی پوچھتا نہیں۔“

”سب جو یہی کام کرتے ہیں۔ رات میرا باپ میری ماں سے کہہ رہا تھا کہ اس نے واسقہ کے گھر سے ڈھیر سارے سکے چرائے

ہیں۔“

”اور میری ماں نے موہین کی قیمتی موتیوں کی مالا اڑالی تھی۔ ماں کہتی ہے اسے کسی دوسرے شہر جا کر فروخت کرے گی۔ تو ڈھیر

سارے پیسے ہاتھ آئیں گے۔“

پانچوں بچے سالی کا کھانا کھانے کے بعد ایک درخت تلے پاؤں پسارے بیٹھے تھے۔ آج کا معرکہ مار کر بہت خوش تھے۔ کھانے

پینے کو بھی اچھی اچھی چیزیں ملی تھیں۔ اور بڑھیا کو ستا یا بھی بہت تھا۔ اپنے کارنامے سے وہ بہت ہی خوش تھے۔

کچھ دیر باتیں کرنے اور ستانے کے بعد گیر ویدھا ہو کر بیٹھ گیا اور فریدوں سے بولا ”اب کیا کیا جائے.....“

”کچھ سوچو نا..... ہم تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہیں.....“

”اچھا.....“

”ہاں“

اب شاتم رمیلہ اور سیبہ بھی سیدھی ہو بیٹھیں۔ کوئی نئی شرارت کرنے کے لیے وہ تیار تھیں فریدوں اور گیر و سوچ ہی رہے تھے کہ ایک کتاب جو قدرے ننگڑا رہا تھا۔ ادھر آ نکلا کھانے کی پچی کھچی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ وہ انہیں دیکھ دیکھ کر زبان نکالنے لگا اس کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔

شاتم اس کی طرف دیکھ کر بولی ”بھوکے ہو.....“

رمیلہ نے ہنس کر کہا ”کچھ کھڑے ڈال دیتے ہیں اسے“

”میں ڈالتی ہوں.....“ سیبہ نے کتے کو دیکھ کر کہا۔ پھر ایک گول سا پتھر اٹھایا اور نشانہ باندھ کر کتے کو دے مارا۔

اس کی اس حرکت پر رمیلہ اور شاتم نے خوب تالیاں بجانیں۔ پھر وہ بھی پتھر اٹھا کر کتے کو مارنے لگیں۔ کتے کے پتھر لگتا تو وہ چاؤں چاؤں کرتے ہوئے ادھر ادھر بھاگتا۔ جدھر جاتا ادھر سے پتھر پڑتا۔

ان کے دیکھا دیکھی فریدوں اور گیر و بھی گول گول پتھر اٹھا کر کتے کو مارنے لگے۔ پانچوں نے اس زخمی اور چیختے چلاتے کتے کو اس طرح گھیر لیا کہ وہ کہیں بھاگ ہی نہ سکتا تھا۔ وہ پتھر کھا کھا کر زخمی ہوتا رہا۔ یہ بچے بڑے سفاکانہ انداز میں کتے کو پتھر مارتے ہوئے تھقبے لگا رہے تھے۔ تالیاں پیٹ رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے۔

پھر

جانے کیسے کتا وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

”بھاگ نکلا کم بخت“ فریدوں بولا..... ورنہ میرا ارادہ تھا کہ اس کی ٹانگ میں رسی باندھ کر اسے دور تک گھسیٹا

جائے.....“

”ہائے پہلے بتا دیتے“ سیبہ بولی ”ہم اسے بھاگنے ہی نہ دیتے.....“

”کم بخت“ شاتم بڑبڑائی۔

”چلو کوئی اور آ جائے گا“ رمیلہ بولی۔

وہ سب باتیں کر رہی رہے تھے کہ انہیں درخت کے پیچھے سے کتے کی چاؤں چاؤں پھر سنائی دی۔ فریدوں ایک دم ہی پلٹ کر

ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا ”لگتا ہے شامت اسے پھر گھیر لائی ہے۔“ باقی بچے بھی اٹھ کر ادھر دیکھنے لگے۔

لیکن

وہ سب دیکھتے ہی دیکھتے رہ گئے۔ اپنی جگہ سے جنبش کرنے کی بھی جیسے ہمت نہ رہی انہوں نے دیکھا۔ وہ زخمی کتا ادھر ہی آ رہا

تھا۔

اور

اور

اس کتے کے پیچھے پیچھے ایک بزرگ جس کی ریش اور سر کے بال بالکل سپید تھے اور جس نے سفید براق لباس زیب تن کر رکھا تھا چلا آ رہا تھا۔ بزرگ کے چہرے پر نور برس رہا تھا۔ اس کی پیشانی چمک رہی تھی اور اس کی ذہین آنکھوں میں بڑی ملامت تھی۔ اجنبی ان کے قریب آ کر رک گیا۔

پانچوں بچے اب تک خاموش اور قدرے حیران کھڑے تھے۔ ایسا معزز اتنا بارعب اور پروقار اور پر نور بزرگ انہوں نے آج پہلی بار دیکھا تھا۔

”پیارے بچو..... بزرگ نے پھر کہا.....“ کیا تمہارے ہاں بزرگوں کو سلام کرنے کا رواج نہیں۔ بچے شرمندہ ہو گئے۔ فریدوں نے قدرے ہمت کی اور سر نفی میں ہلانے کو تھا کہ گیر بولا۔

”ہے رواج۔ ہم کوئی غیر مہذب لوگ نہیں“

”بزرگ اس کے جھوٹ پر مسکرایا۔ پھر پوچھا“ اس بیچارے کتے کو کس نے زخمی کیا ہے“

”ہمیں کیا خبر.....“ اب شام ہمت سے جھوٹ بولا۔

”تم سب کو خبر نہیں.....“ بوڑھا ان کے جھوٹ پر مسکرایا

”ہاں ہم سب کو خبر نہیں کہ اس کتے کو کس نے زخمی کیا ہے“ رمیلہ اور سیبہ نے بھی جھوٹ بولا۔ اجنبی پھر مسکرایا۔ اور جھک کر ہاتھ میں پکڑے کپڑے سے کتے کے زخم کو صاف کرنے لگا۔ سب بچے بہت حیران ہوئے اس شہر میں تو کوئی انسانوں سے بھی اتنی ہمدردی نہ کرتا تھا جتنی یہ اجنبی ایک بے زبان جانور سے کر رہا تھا۔

”اے اجنبی.....“ گیر سے نہ رہا گیا وہ پوچھ ہی بیٹھا ”تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔ ہم نے اس شہر میں تمہیں پہلے تو کبھی

نہیں دیکھا.....“

بوڑھا کتے کے زخم صاف کر کے اس پر سفوف سا چھڑک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر کندھے پر ڈالے چھوٹے سے مشکیزے سے پانی لے کر ہاتھ دھوئے کتے کو پچکار کر دوسری طرف بھیج دیا اور ہاتھ پونچھتے ہوئے گیرو کی طرف دیکھ کر بولا ”ہاں تم نے مجھے پہلے نہیں دیکھا۔ میں آج صبح ہی اس شہر میں آیا ہوں.....“

”کہاں سے آئے ہو“ فریدوں نے ہمت کی۔

”مسرتوں کے شہر سے۔ مجھے دنیا دیکھنے کا شوق ہے۔ میں شہر شہر گھومتا ہوں۔ لیکن اس شہر میں آ کر مجھے سخت مایوسی اور پریشانی ہوئی ہے۔“

”کیوں؟“ تقریباً سبھی بچوں نے حیرت سے پوچھا۔

”اس لیے کہ یہاں ہر کوئی گناہوں کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔ ہر ایک کے ذہن پر گناہوں اور برے کاموں کا بوجھ لدا ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہاں کے بچے بھی اس بوجھ تلے دبے ہیں.....“

کیسا بوجھ.....؟“ گیرو نے جلدی سے سوال کیا۔ تم کیسی باتیں کر رہے ہو اجنبی“..... ”آہ میرے بچو۔ تم کتنے بے خبر ہو۔“ وہ افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے بولا

”کس بات سے“ اب شام نے پوچھا۔

”اس بات سے کہ تم جانتے تنگ نہیں کہ تمہارے ذہن کتنے بھاری بوجھ لیے ہوئے ہیں۔ اور وقت کے ساتھ ان میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے.....“

”ہمیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو“ فریدوں نے سر جھٹکا۔

”لیکن“

سیہہ ملائمت سے بولی ”اچھے بزرگ تمہاری باتیں مجھے اچھی لگ رہی ہیں۔ ہمیں سمجھاؤ تو.....“

”ہاں ہاں بتاؤ تو کچھ ہمارے بھی پلے پڑے“ گیرو ابھی تک اکڑا کھڑا تھا۔ لہجے میں بدتمیزی بھی تھی

بزرگ نے پھر بھی مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور بولا ”سنو میرے بچو۔ تم یا تمہارے چھوٹے بڑے جب بھی کوئی برا کام کرتے ہیں۔ تو ان کے ذہن پر گناہ کا بوجھ لدا جاتا ہے تم یا کوئی اور جب بھی کوئی گناہ کرتا ہے۔ تو اس بوجھ میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور دماغ بوجھل ہو جاتا ہے۔“ بزرگ بڑی سنجیدگی سے بچوں کو سمجھانے لگا۔

لیکن

کسی کے پلے کچھ نہ پڑا۔

اس لیے گیر و تمسخر سے بولا ”ہم کوئی گناہ کرتے ہی نہیں.....“

بزرگ متانت سے بولا ”تم لوگوں کے گناہ اتنے بڑھ گئے ہیں کہ تمہارا خوبصورت شہر ویران ہو گیا ہے۔ آسمان کالا ہو رہا ہے ندی کا پانی گدلا ہے اور تمہارے بڑے بتا رہے تھے کہ اب فصلیں جل رہی ہیں جانوروں نے دودھ دینا کم کر دیا ہے اور پھلوں میں کیڑے پڑ رہے ہیں۔ جھوٹ بولنا چوری کرنا دوسروں کو دکھ دینا اذیت پہنچانا ظلم کرنا..... بزرگ لمبی فہرست گنوانے لگا.....“ تو تو کیا یہ گناہوں کی وجہ سے ہے“ شاتم ہکلائی۔

ہاں میرے بچو۔ خدا نے یہ دنیا انسان کے لیے بنائی ہے۔ یہ بہت خوبصورت ہے۔ انسان کے لیے خدا نے ہر چیز پیدا کی ہے۔ ساتھ ساتھ عقل بھی دی ہے۔ زندہ رہنے کے کے گھر بھی سکھائے ہیں۔ اخلاق و کردار کے وصف بھی اپنے پیغامبروں کے ذریعے انسان کو سکھائے ہیں۔ لیکن افسوس کہ اس شہر کے لوگ سب کچھ بھول کر صرف اور صرف گناہوں کی طرف مائل ہیں۔ اسی لیے ان کے ذہنوں پر بوجھ ہے۔

بچے توجہ سے بزرگ کی باتیں سن تو رہے تھے۔ لیکن سمجھ نہ پا رہے تھے۔ اسی لیے جب بزرگ چپ ہوا۔ تو گیر و بولا ”میرے ذہن پر تو کوئی بوجھ نہیں۔“

فریدوں نے سر ادھر ادھر ہلایا اور قہقہہ لگا کر بولا..... ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو۔ ”دیکھو میرا سر ہلکا پھلکا ہے میں کوئی بوجھ محسوس نہیں کر رہا.....“

”اور مجھے بھی کوئی بوجھ محسوس نہیں ہو رہا.....“ سیبہ بولی۔

شاتم نے بھی سر ادھر ادھر ہلایا اور ہنس کر بولی..... میرے دماغ پر کوئی بوجھ نہیں۔“

اجنبی بچوں کو دیکھ کر شفقت سے مسکرایا اور بولا..... صبح جب میں تمہارے شہر کے کچھ بڑے آدمیوں سے ملا۔ تو انہوں نے

بھی یہی کہا.....“

”پھر“ بچے دلچسپی سے بولے۔

”پھر میں نے ان کے ذہنوں کے بوجھ ان پر ظاہر کر دیئے۔ خدا نے مجھے یہ قوت بخشی ہوئی ہے کہ میں ذہنوں کے بوجھ ظاہر کر

سکتا ہوں.....“

بچے حیرانگی سے ایک دوسرے کو ٹکنے لگے۔ پھر گیرودہ قدم آگے بڑھا اور بولا ”تم سے وہ بوجھ دکھا سکتے ہو.....“

”اللہ کے حکم سے“ بزرگ نے کہا۔

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اللہ کے حکم سے ذہن کا بوجھ پر کمر پر آ جاتا ہے۔ خدا نے یہ قوت مجھے ودیعت فرمائی ہے۔“

گیرودہ نے قہقہہ لگایا اور بولا ”حد ہو گئی۔ ایک تو ہمارے ذہنوں پر کوئی بوجھ ہی نہیں اس پر تمہاری کرامت کہ بوجھ نمودار ہو جائیں گے کیسے بھلا؟“

”ایسے کہ وہ گٹھڑی کی طرح تمہاری پشت پر نمودار ہو کر جسم کا حصہ بن جائیں گے۔“

”ہاں ہاں ہمارے بوجھ بھی نمودار کرو تو جانیں..... شاتم آگے بڑھی۔

اب فریدوں رمیلہ اور سہیہ نے بھی بزرگ کی بات کا تمسخر اڑاتے ہوئے یہی بات کہی اجنبی افسردگی سے مسکرایا۔

”اچھا تمہاری مرضی ہے تو میں کر دکھاتا ہوں.....“

”دکھاؤ.....“

”تم سب آنکھیں بند کر لو۔ اور جب میں کہوں آنکھیں کھولو تب ہی کھولنا۔“

”اچھا“ سب نے کہا۔

”آنکھیں بند کر کے کوشش کرو کہ سارے خیالات تمہارے ذہن سے نکل جائیں۔ چلو بند کرو آنکھیں۔ اور ذہن سے سب

خیالات نکالنے کی کوشش کرو.....“

شاتم فریدوں اور رمیلہ کو ذرا ڈر محسوس ہوا۔ لیکن جب سہیہ اور گیرودہ کو آنکھیں بند کرتے دیکھا تو انہوں نے بھی آنکھیں بند کر

لیں۔

بچے اپنے طور سے کوشش کرنے لگے کہ ان کے ذہن سے خیالات نکل جائیں۔ دوسرے ہی لمحے انہیں یوں محسوس ہوا کہ ان کا

ذہن ہلکا پھلکا ہو کر فضاؤں میں گھوم رہا ہے۔

بزرگ چند لمحے خود آنکھیں بند کئے کچھ پڑھتا رہا

پھر

اس نے گھمبیر آواز میں کہا ”بچو آنکھیں کھولو“

سب بچوں نے آنکھیں کھولیں۔ گہرو آنکھیں کھولتے ہی بولا ”ہاں تو کہاں نمودار۔ لیکن وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ اسے اپنی پشت پر خاصہ بارسا محسوس ہوا۔ وہ چونک کر اپنی پشت پر ہاتھ مارنے لگا۔ گوشت کی گٹھڑی نما چیز پشت پر محسوس کر کے وہ خوفزدہ ہو گیا۔

شاتم نے فریدوں کی پشت دیکھی تو چیخ ماری۔ سیہ نے بھی محسوس کیا اور ررمیلہ کی پشت کا کب دیکھا کر خوف سے پہلی پڑ گئی۔

سب بچوں کی پشت پر گوشت کے کوہان سے ابھر آئے تھے جن کا بوجھ وہ محسوس کر رہے تھے۔

فریدوں کی گھگی بندھ گئی خوفزدہ ہو کر بولا ”یہ تو الگ بھی نہیں ہو رہا جسم کا حصہ بن گیا ہے۔“

”میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں“ گہرو روہانسا تھا..... ”یہ کیسے غائب ہو گا اچھے اجنبی اسے ختم کر دو.....“

اجنبی افسردگی سے بولا..... ”اب یہ کیسے تم سے الگ ہو سکتا ہے یہ گناہوں کا بوجھ ہے“

”اچھے بزرگ اس بوجھ کو واپس ہمارے ذہنوں میں پہنچا دو..... بچوں نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

یہ ہمیں بے حد تکلیف بھی دے رہا ہے اور جب ہم گھروں کو لوٹیں گے تو لوگ دیکھیں گے ہمارے لیے شرمندگی کا باعث بھی ہو

گا۔

بزرگ افسردگی سے بولا ”اب یہ میرے بس کا کام نہیں۔“

”کیوں..... بچے رو رہے تھے۔

”میں فقط اسے ظاہر کر سکتا تھا.....“ بزرگ بولا۔

”تو کیا ہم عمر بھر یہ بوجھ اٹھائے پھریں گے.....“ فریدوں بولا۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

سب بچے رونے لگے۔

”روو نہیں بچو“ بزرگ نے انہیں تسلی دینے کو کہا..... ”تم چاہو تو یہ بوجھ دور ہو سکتے ہیں.....“

”کیسے۔ جلدی سے بتائیں محترم بزرگ“ اب گہرو بڑی تمیز اور انکساری سے بولا بزرگ کے چہرے پر مسرت لہرائی۔

پھر

اس نے بچوں سے کہا ”صبح تمہارے کچھ بڑوں نے بھی مجھ سے ضد کی تھی کہ میں ان کے ذہنی بوجھ ان کی پشتوں پر ظاہر کر کے دکھاؤں۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ وہ ذہنوں پر گناہوں کے بوجھ لادے پھر رہے ہیں“

”ان کے بوجھ بھی پشتوں پر کب کی صورت میں نکل آئے ہیں..... وہ بھی تمہاری طرح پریشان ہیں اور لوگوں کے سامنے اس حالت میں آنے پر شرمندگی محسوس کریں گے۔“

”پھر کچھ بتائیے بھی کہ اس کا علاج کیا بتایا ہے آپ نے ان کو ہمیں بھی بتائیں“

اس کا علاج یہاں ممکن نہیں.....“ بزرگ بولا۔

”تو کہاں ممکن ہے۔“ بچے بیک زبان بولے۔

”میرے شہر میں جو یہاں سے ہزاروں کوس دور ہے“ وہ بولا ہے۔

”ہزاروں کوس“ بچے بے طرح گھبرا گئے۔

”گھبرانے کی بات نہیں۔ یہ فاصلہ پہاڑوں کے راستے طے کیا جائے تو کچھ زیادہ نہیں۔ وہ دیکھو۔ وہ جو پہاڑ نظر آ رہا ہے نا اس

کے پار میرا شہر ہے۔

”مگر وہ پہاڑ تو بہت دور ہے اچھے اجنبی“ فریدوں مٹو دبانہ انداز میں بولا۔

”نہیں۔ یہ ایسے دکھائی دیتا ہے۔ اگر تم کل ہی اپنا سفر شروع کر دو۔ تو پانچ چھ میں میرے شہر میں پہنچ جاؤ گے.....“ اجنبی نے

انہیں تسلی دی اور بولا ”تمہارے بڑوں کا بھی یہی ارادہ ہے جن کے پاس کب نکل آئے ہیں وہ کل صبح سویرے اپنا سفر شروع کر دیں

گے = وہ سب اس ندی کے پاس اکٹھے ہوں گے۔ اس موڑ پر“ اجنبی نے جگہ دکھائی تم بھی ان کے ساتھ چل پڑنا۔ اچھا بچو خدا حافظ۔

خدا تمہیں گناہوں کا یہ بوجھ اتارنے کی ہمت دے۔ خدا حافظ بچو!“

اجنبی نے ہاتھ ہلایا اور ایک سمت کو چل دیا۔

بچے کچھ دیر اس کو جاتے دیکھتے رہے۔ پھر ایک دوسرے کے کب دیکھ افسوس کرنے لگے کہ ناحق بزرگ سے ضد کی۔

لیکن

اب تو چارہ نہیں تھا۔ کل بڑوں کے ساتھ انہیں بھی سفر پر روانہ ہونا ہی تھا۔

رات خواب اتر آئی تو وہ چھپتے چھپتے اپنے گھروں کو گئے۔ رات ٹھیک سے سو بھی نہ سکے کہ پشتوں کے کب تنگ کر رہے تھے۔ ماں باپ کے تو وہ سامنے گئے ہی نہیں۔ ویسے بھی ماں باپ کو نسا ان کا دھیان رکھتے تھے۔ وہ کئی کئی دن پہلے بھی باہر گزار آیا کرتے تھے اور ماں باپ پوچھتے تک نہیں تھے۔

رات جانے کب ان کی آنکھ لگی۔

لیکن

صبح وہ بہت جلدی اٹھ گئے۔ منہ اندھرے گھروں سے نکلے اور ندی کے موڑ کی طرف چل دیئے۔

بچوں کے چہروں پر کوفت اور اذیت کے سائے لہرا رہے تھے۔ ہر کوئی اپنی پشت پر اٹھے کوہان سے ہراساں تھا۔ وہ سب ندی کے کے موڑ کی طرف جا رہے تھے۔

”میں جب سوکراٹھانا.....“ فریدوں نے گیسو سے کہا۔

”تو تم نے سوچا ہوگا کہ یہ پشت کا گٹھڑ محض اک خواب تھا“ گیسو بولا۔

”واقعی.....“ فریدوں نے کہا ”لیکن جب ہاتھ لگا یا تو گوشت کا یہ گٹھڑا موجود تھا۔ میں بہت پریشان ہوا.....“

”پریشان کی بات تو ہے ہی۔“ شاتم بولی۔ ”مجھ سے تو رات ٹھیک سے سویا ہی نہیں گیا اوندھے منہ پڑی رہی“

”میں بھی“ سیبہ نے کہا ”چت لیٹنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔“

رمیلہ روہانسی ہو کر بولی ”جو یہ کب ٹھیک نہ ہوئے تو.....“

”ہائے ہائے رملہ ایسی مایوسی کی باتیں نہ کرو۔ جس اجنبی بزرگ نے یہ کب ظاہر کئے اس کے کہنے پر تو ہم لوگ اس کے شہر جا

رہے ہیں۔ اس نے جھوٹ تو نہیں بولا ہوگا.....“

”ہاں۔ جھوٹ بولنے کے تو ہم لوگ عادی ہیں“ گیسو نے کہا۔

”لیکن ہمیں کیا پتہ کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے“ شاتم بولی ”ہمیں کبھی کسی نے تھوڑا ہی تھا“

یہ بات تو ہے ہمیں کبھی بڑوں نے یہ باتیں نہیں بتائی تھیں.....؟“

”کبھی نہیں۔ ہمیں تو ہمارے ماں باپ نے بھی کبھی یہ باتیں نہیں بتائی تھیں۔ جانتے ہی نہیں کہ یہ سب باتیں گناہیں.....“

”ایک غلطی ہوگئی نا.....“

”کیا؟“

”ہمیں اجنبی بزرگ کو بتا دینا چاہیے تھا کہ ہمیں کبھی کسی نے بتایا ہی نہیں کہ جھوٹ بولنا چوری کرنا دھوکہ دینا ظلم کرنا“

شاتم نے گہرو کی بات کاٹتے ہوئے کہا..... ”ٹھیک ہے ہمیں کسی نے کبھی یہ باتیں نہیں بتائیں لیکن ذرا سوچو تو جب ہم کسی کو تکلیف پہنچاتے تھے۔ تو وہ کتنا دکھ اٹھاتا ہوگا ہم نے بوڑھی سالی کو منہ کے بل گرایا اس کا خون بہہ نکلا۔ کیا اسے چوٹ لگنے سے کوئی تکلیف نہ ہوئی ہوگی۔“

”ضرور ہوئی ہوگی“ رمیلہ بولی ”ہمیں ذرا سی چوٹ لگے تو تکلیف ہوتی ہے نا۔“

”ہاں..... یہ باتیں سوچنے کی ہیں.....“

پانچوں بچے اپنی اپنی ذہنی استعداد کے لحاظ سے باتیں کرتے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ ہلکا ہلکا اندھیرا چار سو پھیلا تھا۔ اور جس راستے وہ جا رہے تھے اور اس پر ابھی کوئی آدمی یا جانور بھی نہیں آ جا رہا تھا

”شکر ہے ہمیں اس حالت میں کسی نے دیکھا نہیں.....“ سیہہ بولی۔

”کتنے شرم کی بات ہے میں نے تو ماں کی چادر اپنی پشت پر ڈال لی ہے“ شاتم نے کہا۔

”شکر ہے گھر والوں کو بھی پتہ نہیں چلا۔“ گیر و بولا۔

”یارا نہیں پتہ چل بھی جاتا پھر بھی کیا ہوتا۔ کونسا انہوں نے فکر مند ہونا تھا ہمارے لیے“ فریدوں نے تلخی سے کہا

سب باتیں کرتے ہوئے آگے پیچھے کچے راستے پر چلے جا رہے تھے۔ کبھی گیر و آگے ہو جاتا کبھی فریدوں۔ تینوں لڑکیاں ساتھ ساتھ ہی چل رہی تھیں۔

دائیں ہاتھ مڑتے ہی انہیں ندی کا موڑ نظر آیا۔ وہاں کچھ لوگوں کے ہیولے بھی دکھائی دیئے

”وہاں کچھ لوگ پہنچ چکے ہیں گیر و نے آنکھیں پھیلا پھیلا کر ندی کے موڑ کی طرف دیکھا۔“

”جانے کون لوگ ہیں وہ؟“ فریدوں نے کہا۔

”بھئی اسی شہر کے ہیں نا..... ابھی قریب پہنچ کر پتہ چل جائے گا.....“

”چلو ذرا تیز قدم اٹھاؤ“

”ہاں ان سے ملیں تو سہی.....“

”ہمیں اکٹھے ہی جانا ہے اجنبی بزرگ نے بتایا تو تھا.....“

”ہاں۔ وہ لوگ شاید ہمارا ہی انتظار کر رہے ہیں.....“

”شاید.....“

وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگے۔

”گیر و ایک بات“ شاتم بولی

”کیا؟“

”بھئی ہم لوگوں نے کھانے پینے کو تو کچھ لیا ہی نہیں۔ پانچ چھ دن کا سفر کرنا ہے“ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی“ گیر بولا۔“ اس

علاقے میں پانی کی بہتات ہے اور درخت بھی پھلوں سے لدے ہیں۔ کچھ ہو ہی جائے گا.....“

”ہو سکتا ہے یہ بڑے لوگ کھانے پینے کا سامان ساتھ لائے ہوں

”لائے ہوں گے تو اپنے لیے ہمیں تھوڑا ہی دیں گے۔ پتہ نہیں ہے کہ ہمارے شہر کا دستور کسی کو کچھ دینے کا نہیں لینے کا ہے۔

چھیننے کا..... لوٹنے کا.....“

”ہوں“

”خیر دیکھیں گے۔ کیا ہوتا ہے“

سب آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ کبھی چپ ہو جاتے کبھی باتیں کرنے لگتے۔ ”اچانک ہی شاتم رک کر بولی“ ارے

”کیوں کیا ہوا.....؟“ سب نے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ دیکھا؟“

”کیا؟“

”یہ موہین نہیں ہے۔ پتھر کے پاس۔ پھولدار لبادے میں.....“

سب نے غور سے ادھر دیکھا۔ وہ موہین ہی تھی۔ اس نے پھولدار لبادے میں پورا جسم لپیٹ رکھا تھا۔ چہرہ بھی نصف کے قریب

ڈھکا ہوا تھا۔ چونکہ اس کا رخ ادھر تھا۔ اس لیے شاتم نے اسے پہچان لیا۔

”ہاں ہاں یہ تو موہین ہی ہے.....“ سب بولے۔

”اور وہ ساتھ و اسقہ لگ رہا ہے“ فریدوں نے کہا۔ ”بلکہ سلٹی لباس میں ہاں و اسقہ ہی ہے“

اب سب جلد جلد قدم اٹھا رہے تھے ان کا تجسس بڑھ رہا تھا۔

پھر

گیر نے کشت یار کو پہچان لیا۔ وہ انتہائی ظالم اور سفاک آدمی اس وقت اپنی پیٹھ کے بوجھ سے جھکا ہوا تھا۔ بچوں سے اسے نفرت تھی بچے اس ناپسند کرتے تھے۔

گیر کو ایسے حالات میں بھی اسے یوں دیکھ کر ہنسی آ گئی۔

اب تو بچوں کو وہ پانچوں بخوبی نظر آ رہے تھے۔ مہیب بھی ان میں تھا۔ جو بہت بزدل ڈرپوک لیکن دھوکے باز بھی تھا۔ پرلے درجے کا جھوٹا اور فریبی تھا۔ اس کے ساتھ صف بھی تھی۔ جو تھی تو بڑی بدمزاج اور اکڑ والی لیکن بچوں سے اسے بہت پیار تھا۔ اس لیے بچے بھی اسے پسند کرتے تھے۔

وہ سب قریب پہنچے تو سب سے پہلے صف ہی نے انہیں دکھا اور بے اختیار انہ بولی ”بچو تم بھی اس اجنبی کی باتوں کا شکار ہو گئے۔ تمہاری کمرس بھی جھکی ہیں اور کب نکل آئے ہیں“ بچے اس کے قریب آ گئے۔

خلاف معمول اور خلاف توقع کشت یار بھی بچوں کو دیکھ کر ملائمت سے بولا ”تمہیں بھی وہ اجنبی بزرگ ملا تھا۔“

”جی“ بچے ڈرے ڈرے سے تھے۔

”کوئی بات نہیں۔ ہم سب نے ایک ہی جگہ جانا ہے“ صف بولی ”بچو تم گھبراؤ نہیں ہم سب تمہارے ساتھ ہیں.....“

بچے ان بزرگوں کی شفقت سے کچھ حیران نظر آ رہے تھے۔ و اسقہ اور مہیب بھی ان سے اچھے لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔

”اب ہمیں سفر شروع کر دینا چاہیے“ کشت یار نے ادھر ادھر دیکھا ”سورج نکلنے سے پہلے ہمیں اپنے شہر کی حدود سے نکل جانا چاہیے۔“

”ہاں“ مہیب نے کہا ”تا کہ شہر کے لوگ ہماری یہ حالت دیکھ نہ لیں۔“

”ہم پہلے ہی شرمندگی کے احساس سے چور چور ہیں“ موہین بولی۔

”تو اٹھاؤ قدم“ کشت یار قدم اٹھاتے ہوئے بولا۔

”آپ سب کو معلوم ہے کہ ہم نے اس سامنے والے اونچے پہاڑ کی دوسری طرف جانا ہے؟“ گیرو نے آہستگی سے کہا

واستقلنی سے بولا ”ہاں۔ اس کے پار ہی اس اجنبی بزرگ کا مسرتوں کا شہر ہے اور ہمارے یہ کب وہیں جا کر درست ہو سکتے ہیں“
”ہمیں جلد از جلد وہاں پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیے“ کشت یار بولا۔

”لیکن.....“ موہین پریشانی سے بولی ”میں کیسے چل پاؤں گی

”اب تساہل پسندی کو ختم کرو۔ اور چلنا شروع کر دو۔ یہ مصیبت تم نے بہر صورت اٹھانا ہی ہے..... ذہن سے آرام و
آسائش کا خیال نکال دو.....“

”کشت یار تم تو موہین کو ڈانٹنے لگے۔ بھئی آرام سے سمجھاؤ۔ جانتے تو ہو۔ وہ کتنی سہل پسند ہے.....“

اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ہماری پیٹھوں پر لدے یہ گھٹڑا ایسے ہی ٹھیک سکتے۔ اب ہمیں راستوں کی کٹھنائیاں اور مصیبتیں مل جل کر
ہی برداشت کرنی ہیں۔“

بچے بڑوں کی باتیں سن رہے تھے۔ انہیں حیرانگی ہو رہی تھی کہ اکھڑ ظالم اور بد مزاج لوگ ایک دوسرے کا خیال رکھنے کی باتیں کر
رہے تھے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں تھا۔

چلتے چلتے

چلتے چلتے

وہ سب اب ایک سرسبز و شاداب میدان میں پہنچ چکے تھے۔ ان کے شہر کی حد کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ اسی لیے سب ندامت اور
شرمندگی کی غلبے سے کسی حد تک نکل چکے تھے۔

سورج نکل آیا تھا اور اس کی سنہری کرنیں ہر سو اجالا پھیلا رہی تھیں۔ سب اور مست خرام ہو گئے چل رہی تھیں۔ سبزے اور
پھولوں کی مہک فضا میں رچی ہوئی تھی۔ میدان کے گرد گرد بڑے گھنے اور چھتتا اور درخت تھے۔ جن کے تنوں سے نازک اندام لال
پیلے پھولوں والی بیلین لپٹی ہوئی تھیں۔

موسم انتہائی خوشگوار تھا۔

دس نفوس پر مشتمل یہ قافلہ رواں دواں تھا۔ کبھی بچے بڑوں کے ساتھ ساتھ چلتے کبھی آگے نکل جاتے اور کبھی جان بوجھ کر پیچھے رہ

جاتے۔ وہ پشتوں پر بوجھ کے باوجود بڑوں سے زیادہ تازہ دم تھے۔

فریدوں اور گیر تو ہنس کر کہہ رہے تھے..... لگتا ہے ہم نے یہاں ہی اپنی پشتوں کو بوجھ اتار پھینکا ہے۔ یا پھر ہم اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ پتہ ہی نہیں چل رہا کہ ہمارے کب نکلے ہوئے ہیں اور ڈھیر سارا گوشت ہماری گردن اور کندھوں کے درمیان لٹک رہا ہے“

ان کی باتیں سن کر کشت یار نے واسقہ سے کہا۔ ”ان بچوں کی سوچ کتنی مثبت ہے ہمیں بھی ان ہی کی طرح سوچنا چاہیے۔ منزل تک پہنچنے کے لیے ایسی سوچ بڑی معاون ثابت ہوگی“

”ہاں ہوگی.....“ واسقہ نے جواب دیا۔

”کیوں خیریت“ کشت یار نے پوچھا۔ ”تھک گئے ہو..... ابھی سے“

”نہیں.....“ واسقہ نے منہ بنایا پھر موہین کی طرف اشارہ کیا۔ جو پاؤں اٹھا کر چلنے کی بجائے پاؤں گھسیٹے چلی آ رہی تھی۔

کشت یار کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

موہین سب سے پیچھے تھی۔ کشت یار کو اپنی طرف دیکھتے پایا تو بولی ”ٹھہر و کشت یار“

”کیوں؟“ کشت یار کے ساتھ سب ہی رک گئے۔

موہین قریب آئی اور بمشکل سانس درست کرتے ہوئے بولی ”کتنا خوبصورت علاقہ ہے کیا اچھا منہ ہوگا کہ یہاں تھوڑی دیر آرام کر لیا جائے“

صاف نے منہ بنایا اور بولی ”ابھی راستہ کتنا ہی کتنا ہے؟ تمہیں آرام کی پڑ گئی۔“

”ہرج کیا ہے۔ راستہ طے ہو ہی جائے گا“ موہین جو انتہائی سہل پسند تھی بہ منت بولی تو کشت یار نے جواب دیا ”بہتر ہے۔ تم یہاں آرام کرو۔ جب مکان اتر جائے تو چلی آنا ہم تو رکنے سے رہے“

کشت یار کی بات پر صاف اور بچے ہنس پڑے۔ موہین نے برا سا منہ بنایا۔ اور بے دلی سے قدم اٹھانے لگی۔

وہ باتیں کرتے قدم قدم چلتے آگے بڑھنے لگے۔

اور

انہوں نے وہ وسیع و عریض سرسبز و شاداب میدان پار کر لیا۔ میدان کے آخری کنارے پر پہنچنے سے پہلے ہی انہیں زور و شور سے

بہتے پانی کی آوازیں سنائی دینے لگیں ہوا میں بھی نم آلود ہو گئیں۔ اور پانی کی نرم سی پھوار بھی کسی کسی لمحے ہوا کے دوش سواران کے چہروں کو چھونے لگی۔

”لگتا ہے کوئی ندی بہ رہی ہے“ کشت یار بولا۔

”ندی ہے یادریا۔“ واسقہ نے کہا۔

”مجھے تو ٹھانھیں مارتا سمندر لگتا ہے“ ڈرپوک مہیب خوفزدہ ہو کر بولا۔

بچے قلائچیں بھرتے آگے پیچھے دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ وہ کنارے تک پہنچے تو وہیں سے چلائے ”یہاں تو ندی بہ رہی

ہے.....“

”بہت تیز رفتار پانی ہے“

”لیکن صاف و شفاف“

”پانی اتنا صاف اور چمکدار ہے کہ نیچے بیٹھے پتھر بھی نظر آ رہے ہیں“

بڑے بھی وہاں جا پہنچے۔ بچے ندی کنارے کھڑے خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

لیکن

کشت یار کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اس نے دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ چمکتی دکتی انکھیلیاں کرتی ندی ہی نظر آئی۔ ندی کے پار وہ

پہاڑ تھا۔ جس پر انہیں پہنچنا تھا۔

لیکن

اس ندی کو عبور کیسے کیا جائے گا۔ دور چور تک کوئی پل نہ دکھائی دے رہا تھا۔ نہ کوئی کشتی نظر آ رہی تھی۔

موہین ہانپتے ہوئے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی۔

”ہم نے اس ندی کے پار جانا ہے“ واسقہ فکر مند سا نظر آنے لگا۔

”لیکن کیسے..... میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ ندی بہت ہی تیز رفتار ہے اسے تیر کر پار کرنا ناممکن ہے.....“

”دور نزدیک پل بھی کوئی نہیں.....“ مہیب ڈرا ہوا تھا۔

”پھر کیا کیا جائے؟“ کشت یار نے کہا۔

گی۔۔۔۔۔“

چرا وہا اپنے دھیان چلا آ رہا تھا۔

چند قدم دور ہی تھا کہ گیر و نے آواز دی ”اے بھائی“

وہ آواز سن کر چونکا سراٹھا کر انہیں دیکھا اور قریب آ کر بولا ”کون ہو تم لوگ؟ تم نے مجھے آواز دی“

”ہاں“

”کیا چاہتے ہو“

کشت یار بولا ”ہم لوگوں نے اس پہاڑ پر جانا ہے۔ لیکن یہ ٹھاٹھیں مارتی ندی راہ میں حائل ہے“

”کیا اسے پار کرنے کا کوئی طریقہ ہے“ صنف بولی۔

”پل تو کوئی ہے نہیں“ واستدہ بولا۔

”تم لوگوں نے جانا کہاں ہے“ چرا وہا بولا۔

”مستروں کے شہر جو اس پہاڑ کی دوسری طرف ہے“

”اچھا۔۔۔۔۔“ اس نے سب کی پشتوں پر نگاہ ڈالی اور سر ہلاتے ہوئے بولا ”تم اس ندی کو پار کر سکتے ہو۔ وہ دیکھو۔ وہ

عزم کا گھاٹ ہے۔ اور جگہ جگہ حوصلے کے پتھر پڑے ہیں۔ اس گھاٹ کے قریب ندی کی روانی از خود کم ہو جائے گی۔ حوصلے کے پتھر

ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ندی کی تہہ میں بچھے ہیں۔ اس عزم کے گھاٹ ہی سے اس طوفانی اور خود سر ندی کو عبور کیا جاسکتا

ہے۔ عزم کے گھاٹ سے ندی میں اترنے کے ہمت کی زینوں جیسی ڈھلانیں بھی ہیں۔ تم لوگ وہاں بے دھڑک چلے جاؤ آسانی سے

گھاٹ سے ندی میں اتر جاؤ گے۔ پھر حوصلے کے پتھروں پر پیر رکھ دینا۔ کوئی دشواری نہیں ہوگی“

چرا وہا بات کر کے آگے بڑھ گیا۔ بچے اور بڑے سب ہی چپ ہو گئے۔۔۔۔۔ عزم ہمت حوصلہ اور سوچ میں پڑ گئے۔

بہر حال

انہیں ندی تو عبور کرنا ہی تھی اس لیے کشت یار نے عزم کے گھاٹ کی طرف چلنے کا اعلان کیا۔

وہ چونکہ سب سے بڑا اور ان سب میں معتبر تھا۔ اسی لیے سب نے اسے اپنا قائد مان لیا۔

”لیکن فریدوں۔ یہاں تو پانی کا بہاؤ بڑا زور دار ہے“ شاتم ڈگمگاتے ہوئے بولی۔

”کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔۔ حوصلے کے پتھر پر مضبوطی سے ہیر جماتی چلو۔۔۔۔۔۔ رمیلہ تم بھی میری طرح پاؤں رکھتی چلو
”اچھا فریدوں بھائی“ رمیلہ نے کہا۔ پتھروں پر توازن رکھنا مشکل تو تھا۔ لیکن فریدوں کی حوصلہ افزائی سے رمیلہ اور شاتم ایک
پتھر سے دوسرے پتھر پر پاؤں رکھتی چلی جا رہی تھیں۔

وہ درمیان میں پہنچے تو فریدوں نے گردن موڑ کر گھاٹ کی طرف دیکھا۔ گہرو شاتم اترنے کی تیاری میں تھا۔ اسی لیے فریدوں نے
اسے آواز دی گہرو اور سیہہ تم دونوں بھی آ جاؤ۔ یہاں اب پانی کا بہاؤ تیز نہیں ہے۔ ہم لوگ آسانی سے ندی پار کر لیں گے“
”اچھا ہم دونوں بھی آ رہے ہیں فریدوں“ گہرو نے دونوں ہاتھوں کا بگل سا بنا کر منہ سے لگا لیا اور زور سے فریدوں کو جواب
دیا۔

اب گہرو نے سیہہ کا ہاتھ پکڑا اور ہمت کے ڈھلانی زینے پر قدم رکھ دیئے۔

”جب بچے جا رہے ہیں۔ تو ہمیں بھی ہمت سے کام لینا چاہیے“ کشت یار نے گہرو کو ندی میں اترتے دیکھ کر کہا۔
”واقعی۔۔۔۔۔۔“ صحت بولی۔

”لگتا ہے ندی میں اترنا مشکل نہیں۔۔۔۔۔۔“ موہین بولی۔

”ہمت سے قدم اٹھانا ہے بس۔“ واسقہ بولا۔

مہیب پرے ہی کھڑا رہا۔ وہ بڑا خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ اور جوں جوں لوگ ندی میں اتر رہے تھے۔ اس کا رنگ فزہور ہوا تھا وہ اتنا
ڈر پوک اور بزدل تھا کہ نہ ہی عزم گھاٹ پر آ رہا تھا۔ اور نہ ہی ہمت اور حوصلے سے نبرد آزما ہونے کی سوچ سکتا تھا۔

سب سے پہلے فریدوں ندی کے پار اترے۔ پھر اس نے رمیلہ اور شاتم کو پانی سے باہر کھینچ لیا۔ تینوں بہن بھائی خوشی سے تالیاں
بجانے لگے۔ رمیلہ تو اچھل اچھل کر آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

باری باری سب ہی کنارے پر اتر گئے۔

سب بہت خوش تھے۔

اچانک صحت کو مہیب کا خیال آیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ ابھی تک عزم کے گھاٹ سے پرے کھڑا تھا۔

”مہیب نہیں آیا۔“ وہ بولی۔

”اوہ ہاں“ کشت یار نے سب پر نگاہ ڈالی اور پھر دوسرے کنارے کی طرف دیکھا۔
 ”نہیں۔۔۔۔۔ میں نہیں آؤں گا“

”ڈرو نہیں میرے بھائی“ صدف نے روہانسی ہو کر کہا ”سنجھل سنجھل کر قدم رکھو آ جاؤ پانی کا بہاؤ تیز نہیں ہے۔“

”ڈر پوک۔۔۔۔۔“ کشت یار چلایا۔۔۔۔۔ ”ڈرو مت تم آسانی سے ندی عبور کر لو دیکھو تو بچے بھی دوسرے کنارے پر پہنچ چکے ہیں اور تم وہیں کھڑے ہو۔“

”عزم کے گھاٹ پر تو آؤ۔“ فریدوں نے زور سے کہا۔

”نہیں نہیں میں جانتا ہوں۔ تم سب مجھے تسلیاں دے رہے ہو۔ پانی کا بہاؤ بہت ہے“ وہ کانپ رہا تھا۔

سب نے باری باری اسے آنے کو کہا۔ لیکن وہ اتنا ڈر پوک اور بزدل تھا کسی کی نہیں مانی۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے میں ندی میں اتر سکتا۔ میں واپس جا رہا ہوں۔ مجھے یوں ڈوب کر مرنا منظور نہیں۔۔۔۔۔“ وہ دوڑتا ہوا

واپس ہولیا۔

سب نے چیخ چیخ کر اسے واپس بلانے کی کوشش کی۔ بچوں نے بھی اور بڑوں نے صدف تو رونے لگی۔

”اب کیا کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔“ واسقہ بولا ”وہ بہت بزدل اور ڈر پوک ہے“

”ساری عمر پشت پر گوشت کا گٹھڑا اٹھائے پھرے گا؟“ صدف نے آنسو پونچھے۔ لوگ اس کا تمسخر اڑائیں گے۔

”اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔“ کشت یار بولا۔۔۔۔۔ ”ہمیں تو اپنا سفر جاری رکھنا ہے وہ سامنے پہاڑ نظر آ رہا

ہے۔۔۔۔۔“

”اب ہم دس کی بجائے نورہ گئے ہیں“ شاتم افسردگی سے بولی۔ بچے بھی مہیب کے اس طرح چلے جانے سے افسردہ ہو رہے

تھے۔

جب تک مہیب نظر آتا رہا وہ سب اسے دیکھتے رہے۔ وہ نظروں سے اوجھل گیا۔ تو کشت یار بولا ”مہیب نے بد مزگی پیدا کر دی

ورنہ سفر بڑے مزے سے کٹ رہا تھا۔“

واسقہ بولا ”اب ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔ دوپہر اتر رہی ہے۔“

”اور بھوک بھی لگ رہی ہے۔“ رمیلہ نے مسکرا کر کہا۔

”ہمیں ایک بستی نظر آئی ہے“

”کہاں“

”وہ۔۔۔۔۔۔ وہ دیکھو۔۔۔۔۔۔ کچھ زیادہ دور بھی نہیں۔۔۔۔۔۔“

”ہاں تھوڑی ہی دیر میں ہم وہاں پہنچ سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔“

”آپ کا کیا خیال ہے“

واستقہ بھی قریب آ گیا اس نے بھی بستی کی طرف دیکھا اور خوش ہو کر بولا ”بڑی خوش قسمتی ہے ہماری۔۔۔۔۔۔ جو بستی نظر آ

گئی۔ ورنہ رات گزارنا مشکل ہو جاتی۔۔۔۔۔۔“

”اندھیرے میں تو پہاڑ انتہائی خوفناک ہو جاتا۔۔۔۔۔۔“ سیبہ نے کہا۔

”بالکل“ موہین نے رکتے ہوئے کہا۔

”چلو پھر سب چلتے ہیں بستی کشت یار نے کہا۔ اس نے رخ موڑا اور بستی کی طرف جانے لگا۔

سب اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اس بستی میں پہنچ چکے تھے۔

اس بستی میں اکا دکا ہی گھر تھے۔ گھر بھی کوئی عالیشان قسم کے نہیں تھے۔ معمولی سے دو دو تین تین کمروں پر مشتمل کچے پکے گھر

بنے ہوئے تھے۔ سڑکیں بھی کچی تھیں کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ تھے۔ اور کہیں کہیں پتھر پیلے ٹیلے۔ دو ایک جگہ پانی کے چشمے بھی

تھے۔

کشت یار صحن اور موہین جیسے امیر کبیر لوگوں نے عام سے گھروں کو دیکھ کر ناک منہ چڑھایا۔

”کیا ہم لوگ رات ایسے گھروں میں بسر کر سکتے ہیں؟“

واستقہ ان کو مخاطب کر کے بولا۔۔۔۔۔۔ ”تم لوگ کسی تفریحی دورے پر نکلے ہوئے نہیں ہو۔ غنیمت ہے۔ جو یہ گھر بھی نظر آ

گئے۔ ورنہ رات پہاڑ پر گزارنا مشکل ہو جاتی۔“

”یہ تو ہے“ صحن نے بیدلی سے سر ہلایا۔

”میں کسی کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاؤں۔۔۔۔۔۔“ فریدوں نے کشت یار سے پوچھا۔

رحمدلی پیالیوں میں گرم گرم کیوڑہ ملا دودھ بھی لے آئی۔ دودھ میں پے ہوئے بادام بھی ملے تھے۔ وہ جانتی تھی ان سب لوگوں کو پہاڑ پر چڑھنے کے لیے توانائی کی ضرورت ہے۔

”واہ واہ۔۔۔۔۔۔“ دودھ کے پیالے ہونٹوں سے لگاتے ہی تقریباً سب بیساختہ کہہ اٹھے اتنا مزیدار اور مقوی الاثر دودھ انہوں نے کب کبھی پیا تھا۔ سب کو اپنی رگوں میں توانائی دوڑتی محسوس ہونے لگی۔

سب کھاپی کر سیر ہو چکے تو واسقہ نے سب سے کہا ”اب رحمدلی کا شکر یہ ادا کرو“ سب نے بڑے جوش انداز میں بی رحمدلی کا شکر یہ ادا کیا۔

”اب ہمیں اجازت دیں۔ سفر لمبا ہے“ واسقہ بولا۔

”ہاں واقعی تم لوگوں کا سفر بھی لمبا ہے۔ لمبا بھی اور دشوار گزار بھی۔ خاصی کھٹنائیاں آئیں گے راستے میں۔۔۔۔۔۔“

”جی ہم جانتے ہیں“ گیر بولا۔

”اور ہم نے بہر طور انہیں پارکانے کا مصمم ارادہ بھی کر رکھا ہے۔ یہ بوجھ ہمیں بہت تلیف دے رہے ہیں۔ اپنے لوگوں کے سامنے تو ہم ان بوجھوں کے ساتھ جانیں سکتے۔“ فریدوں نے کہا۔

”خدا تمہاری مدد کرے“ رحمدلی بولی۔

”اچھا اب ہمیں اجرت دیں“ صف نے آگے بڑھ کر کہا۔

”ٹھیک ہے“ وہ مسکرائی

سب اکٹھے ہو کر کھڑے ہو گئے۔ رحمدلی کو سلام کیا۔ تو جواب دینے سے پہلے وہ بولی۔

”تم لوگ مسرتوں کے شہر جا رہے ہو۔۔۔۔۔۔ اور اس کے لیے تمہیں یہ اونچا پہاڑ عبور کرنا ہے“

”ہاں“

”میں تمہیں چند باتیں بتانا چاہتی ہوں“

”ضرور۔۔۔۔۔۔“

”ایک تو یہ ہے کہ جس راستے آپ اوپر جائیں گے۔ وہاں کہیں دو بہن بھائی رہتے ہیں۔ ایک کا نام غفلت ہے دوسرے کا شک۔ یہ دونوں برے کینہ پرور اور انتہائی چالاک اور خبیث ہیں۔ آتے جاتے مسافروں کو ڈراتے اور بدراہ کرنے کی کوشش کرتے

”میرے خدا“ سیہ نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

رمیلہ ڈر کر فریدوں سے چٹ گئی۔

”کیا یہ کشت یار ہے“ واسقہ بے یقینی سے آگے بڑھا۔

”تو اور کون ہے۔۔۔۔۔۔“ گیر بولا ”کیا تم اتنی جلدی اس کی شکل بھول گئے ہو“

”لیکن اس کی حالت؟“

اب کشت یاران سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ سب اس کی طرف تیزی سے بڑھے اور واسقہ نے اسے کندھوں سے پکڑ کر کہا

”کشت یار یہ سب کیا ہے تم اتنے نڈھال۔ کپڑے پھٹے ہوئے۔ چوٹوں سے برا حال۔۔۔۔۔۔ اتنے بد حال۔۔۔۔۔۔ جلدی

سے بتاؤ کیا ہوا۔۔۔۔۔۔؟“

وہ ایک قریبی پتھر پر بیٹھ گیا۔

اور

نفاہت بھری آواز میں اپنی روئید اوسناتے ہوئے بولا۔۔۔۔۔۔ ”رحمد لی کا بتایا ہوا راستہ بھول کر جنگل میں بھٹک گیا۔ خاردار

جھاڑیوں میں الجھ کر میرے کپڑے پھٹ گئے۔

بڑی مشکل سے اس امیر آدمی کا گھر تلاش کر کے آدھی رات کو وہاں بھوکا پیاسا پہنچا تو اس آدمی کے نوکروں نے مجھے فقیر سمجھ کر

دھتکار دیا۔ میں ان کے مالک سے ملنے کا اصرار کیا تو وہ مجھے مارنے پینے لگے۔ آوازیں سن کر ان کا مالک بھی جاگ اٹھا۔ جب میں

نے اس سے کہا کہ میں اپنے شہر کا امیر معزز آدمی ہوں۔ تو اس نے تمسخرانہ قہقہے لگائے اور نوکروں سے کہا کہ مجھے دھکے دے کر باہر

نکال دیں اور کتے مجھ پر چھوڑ دیں میں گرتا پڑتا راستہ تلاش کرتا بھوکا پیاسا یہاں پہنچا ہوں۔“

سب اس کی داستان سن کر دم بخود تھے۔ وہ خود ہی بولا ”یہ لالچ کی سزاتھی۔ مجھے تم سب لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے

تھا۔۔۔۔۔۔“

”اب تم ہمارے ساتھ کیسے چلو گے۔۔۔۔۔۔؟“ موہین نے پوچھا۔

”یہ ابھی کیسے جاسکتے ہیں؟“ پیچھے سے رحمد لی کی آواز آئی۔ جو ساری باتیں سن رہی تھی سب نے پلٹ کر رحمد لی کی طرف دیکھا۔

وہ بولی۔ ”کشت یار میرے گھر چلیں۔۔۔۔۔۔ میں ان کا لباس تبدیل کرواتی ہوں۔ کھانا کھلاتی ہوں۔ پھر یہ تھوڑی دیر

آرام کر لیں۔ تب تک آپ لوگ چڑھائی چڑھتے جائیں سیدھے ہی تو جانا ہے یہ آپ کو آن ملیں گے۔۔۔۔۔۔
کشت یار کا سر نہامت سے جھک گیا۔ باقی سب نے رحمہ لی کا شکر یہ ادا کیا اور اپنی راہ آگے پیچھے چل دیے۔
رحمہ لی کشت یار کو لے کر گھر آ گئی۔

صبح بڑی تازہ دم اور خوشگوار تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا درختوں میں سے سرسراہتی گزر رہی تھی۔ یہاں بڑے خوبصورت پھولدار پودے بھی تھے۔ جن سے راستہ بزارنگین اور مہک رہا تھا۔ پہاڑ بہت اونچا تھا اور چیز دیو دار اور دوسری کئی اقسام کے گھنے درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

جس راستے پر یہ سب لوگ مسرتوں کے شہر کی تلاش میں جا رہے تھے۔ وہ کچا بھی اور پتھر یا بھی۔ نیڑھا میڑھا ہو کر اوپر جاتا تھا۔ کئی جگہ تو ساتھ ساتھ گھنے اور خوشبودار درخت جاتے تھے کہیں بہت سے گڑھے آ جاتے۔ جہاں راستے پر سنبھل سنبھل کر چلنا پڑتا تھا۔ چونکہ چڑھائی شروع تھی۔ اس لیے یہاں تیزی سے قدم نہیں اٹھائے جاسکتے تھے۔ کچھ ان سب کی پشتوں پر بوجھ لے لے تھے۔ اس لیے قدم اٹھانا اور بھی مشکل لگ رہا تھا۔

پھر

بھی

سب باتیں کرتے آگے کو جھکے چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ اس وقت سب رحمہ لی تعریفیں کر رہے تھے۔
”کتنے خلوص اور پیار سے اس نے ہمیں اپنے ہاں ٹھہرایا۔“

”اتنے مزے کی نیند آئی“

”صبح تازہ دم اٹھے سب“

ناشتہ بھی خوب پیٹ بھر کر کیا ہے۔ کافی دیر روٹی کی ضرورت نہ پڑے گی“ یہاں روٹی ملنے کا امکان بھی نہیں۔“
”شاید راستے کے ارد گرد کوئی چھوٹی موٹی ہستی نظر آ جائے۔“
”لیکن ابھی تو اس کی تلاش کی ضرورت نہیں“

”بالکل بھی نہیں“

”رحمہ لی کے رویے میں اتنا پیار تھا۔ پیار ہی پیار میں اتنا کھلایا کہ بس۔۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔ رمیلہ اور سیبہ نے رفتار دھیمی کر لی۔

اب سب آگے پیچھے اوپر جا رہے تھے۔ دھوپ ابھی تک ملائم تھی۔ روشنی سنہری تھی۔ درختوں سے آنکھیلیاں کرتی ہوا مترنم اور خوشگوار تھی۔ پھولوں کی مہک تازہ تھی۔ راستہ اب قدرے ہموار تھا۔ اور دورو یہ اونچے اور گھنے درختوں کی وجہ سے بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔ یہ پہاڑ بہت اونچا اور بہت بڑا تھا۔ اس کا گھیر میلوں میں تھا۔ سارا پہاڑ سبزے اور پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

سب چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ کافی راستہ طے ہو گیا تھا۔ صف نے دو ایک بار سب سے رکنے کو کہا۔

”تھوڑی دیر آرام کر لیتے ہیں میں سخت ٹکان محسوس کر رہی ہوں“ اس نے کہا۔

”سبھی ایسا ہی محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن ابھی دم ہے ہمیں اور سفر طے کرنا ہے۔ یہاں لگتا ہے ارد گرد گھنا جنگل ہے۔ اس لیے بھی

ہمیں جلد اوپر جانے کی کوشش کرنا چاہیے“

”وہ تو سارا پہاڑ ہی جنگل ہے۔ جدھر دیکھو درخت ہی درخت ہیں کہیں تو روشنی کبھی نہیں نظر پڑتی۔“

صف بولی۔

”بھئی جو کچھ ہے ابھی ہم نہیں رکیں گے“ واسقہ بولا ”چلتے چلو“

”ٹھیک ہے ہم چل رہے ہیں“ سب نے کہا۔

صف بھی بادل نخواستہ قدم اٹھانے لگی۔ لیکن اس کا ارادہ کچھ دیر آرام کرنے کا ضرور تھا۔ اسی لیے کچھ دور جانے کے بعد اس نے

چینج ماری اور وہیں بیٹھ کر پاؤں پکڑ لیا۔

”کیا ہوا؟“

”کیا ہوا صف“

”بھئی بتاؤ“

”پاؤں پکڑ رکھا ہے کچھ چبھ گیا“

”سب اس کے گرد جمع ہو گئے“

صف کراہتے ہوئے بولی ”پاؤں میں چوٹ لگ گئی ہے“

”اوہو“ واسقہ گھبرا گیا۔

”اٹھو تو سہی“ موہین نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”نہیں اٹھا جاتا“ اس نے پھر کراہتے ہوئے کہا۔

”دیکھئے تو دو“ موہین بولی ”خون تو نہیں نکل رہا“

”نہیں۔۔۔۔۔۔ صرف پاؤں الٹ گیا ہے“ صھف پاؤں دباتے ہوئے رونی آواز بولی

”اب کیا کریں“ فریدوں پریشان ہو گیا

”اس کے پاؤں کا علاج کیسے ہوگا“ واسقہ بولا۔

”ہمیں اس سفر پر نکلتے وقت سوچنا چاہیے تھا کہ راستے میں کسی کوچوٹ ووٹ سکتی ہے کوئی مرہم پٹیاں ساتھ لانا چاہئیں تمہیں“

”ہمیں تو کھانے کی چیزیں تک لانا یاد نہ رہیں“ شاتم بولی ”حالانکہ ہمارا سفر اس بزرگ کے کہنے کے مطابق چھ سات روز کا تھا“

”اب ہمیں کیا پتہ تھا“ سیبہ بولی ”کہ راستہ اس طرح کا ہوگا۔۔۔۔۔۔ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آبا بدستوں سے گزر نہ ہو

”

”اب باتوں سے کیا فائدہ اس کی چوٹ کا سوچو“ موہین نے ہمدردی سے کہا۔

”یہاں کیا کیا جا سکتا ہے“ واسقہ ناگواری سے بولا ”صھف کو کسی نہ کسی چڑھائی چڑھنا ہی پڑے گی“

”واسقہ“ صھف غصے سے بولی ”تمہارا پاؤں یوں الٹنا تو دیکھتے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ مجھ سے اٹھ کر کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔ تم

چڑھائی چڑھنے کی بات کر رہے ہو۔

”تو پھر کیا کریں“

”آپ سب لوگ یہیں رکیں۔ میں اور گیر وادھر ادھر جا کر دیکھتے ہیں شاید کوئی مل جائے جو اس چوٹ کے لیے مرہم دے

سکے۔“

”ٹھیک ہے جاؤ“ واسقہ پتھر سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا ”سب کچھ دیر آرام بھی کر لیں گے“ وہ سب پتھروں پر بیٹھ گئے۔

گیر وادھر فریدوں گھنے جنگلوں کی طرف چل دیئے۔

”گیرو“

”ہاں“

”کوئی بات نہیں“ گيرو بولا

”لگتا ہے صحن کو تکليف زياده هي ہے“

”ہاں“

”بھئی دروازہ پھر سے کھٹکھٹاؤ۔۔۔۔۔۔ کوئی سن ہی نہیں رہا۔ اتنی دیر سے کھڑے ہیں ہو سکتا ہے کوئی گھر میں ہو ہی

نہیں۔۔۔۔۔۔“

دروازہ اندر سے بند ہے اس کا مطلب ہے کہ گھر میں کوئی نہ کوئی ضرور ہے۔۔۔۔۔۔“

”پھر دروازہ کھٹکھٹانے پر بھی کیوں نہیں کھولا۔۔۔۔۔۔“

”فریدوں نے آگے بڑھ کر زور سے دروازہ پیٹا“

”اتنی دیر میں سب ساتھی وہاں آگئے صحن شاتم اور موہین کے کندھوں پر بارڈالے لنگڑا لنگڑا کر چل رہی تھی“

واستقہ نے پوچھا ”کچھ ہوا بندوبست“

”ابھی تو دروازہ نہیں کھولا۔۔۔۔۔۔“

”گھر میں کوئی ضرور ہوگا تو ضرور۔۔۔۔۔۔“

”پھر دستک دو“

فریدوں نے واستقہ کے کہنے پر پھر دستک دی“

سب دروازہ کھلنے کے منتظر تھے۔ گيرو کو جھنجھلاہٹ ہونے لگی تھی۔ ”جی چاہ رہا ہے ایک لات ماروں اور دروازہ کھول

دوں۔۔۔۔۔۔ اتنے بے خبر لوگ ہیں کھٹکھٹانے کی آواز ہی ان تک نہیں پہنچ رہی۔۔۔۔۔۔“

”صبر سے کام لو۔“ موہین بولی ”ہو سکتا ہے وہ لوگ سو رہے ہوں“

”دن اتنا نکل آیا ہے۔ دوپہر سر پر آنے کو ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے وہ لوگ سو رہے ہوں“ وہ سب باتیں کر رہے تھے

”کے“

”اندر سے کسی کے قدموں کی آواز آئی“

”کوئی آیا ہے“ رسمیلہ خوش ہوئی

”ہاں قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے“ سیدہ نے کہا۔
”بھئی اب کھول بھی چکو“ قدموں کی چاپ کو بھی کئی لمحے گزر گئے تو گيرو جھلایا۔
حوصلے سے کام لو گيرو“ واسقہ نے کہا۔
”گيرو برا سامنہ کر پرے ہو گیا۔“

”پھر کئی منٹوں کے انتظار کے بعد دروازہ کھلا اور ایک غمگین صورت بیزاری عورت نے دونوں پٹ پکڑے پکڑے ان سب کو

دیکھا

فریدوں تعظیم سے بولا ”محترمہ ہم بہت دیر سے دستک دے رہے تھے۔ کیا آپ سو رہی تھیں۔“
”نہیں تو۔۔۔۔۔۔۔۔“ وہ عورت اک شان سے مسکرا کر بولی ”میں دستک سن رہی تھی“

”پھر۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر آپ نے دروازہ کیوں نہ کھولا“ گيرو تقریباً غرایا۔ وہ پھر مسکرا کر بولی ”جلدی کرنا میری عادت نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔“

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔۔۔۔ عورت بولی ”آپ لوگ کون ہیں۔“
”پھر“

اس نے خود ہی کہا ”آہا تنے سارے لوگ میرے گھر آئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔“

واسقہ نے جلدی جلدی بتایا کہ کس طرح مسرتوں کے شہر کے سفر پر وہ لوگ روانہ ہوئے اور آج شام تک انہیں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ان کی ایک ساتھی کے پاؤں میں چوٹ لگ گئی ہے۔ مرہم پٹی کی تلاش میں وہ اس کے گھر آئے ہیں۔“

”آہا۔۔۔۔۔۔۔۔“ وہ عورت کھل اٹھی پھر بولی ”اندر آ جاؤ سب لوگ میں بڑے شوق سے تمہاری خدمت کروں گی“

وہ دروازے سے ہٹ گئی اور ایک کھلے والان کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک دائرے کی صورت میں کئی کرسیاں پڑی تھیں۔
کرسیاں کبھی خوبصورت اور نئی ضرور ہوں گی لیکن اور چیزوں کی طرح لگتا تھا اہل خانہ ان سے بھی غافل ہیں۔
سب تھکے ہوئے تو تھے ہی آگے بڑھے۔

اور

کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

عورت سب کو بٹھا چکی تو بولی ”کس کے چوٹ لگی ہے۔“

صہف جو آرام سے کرسی میں دھنسی تکان اتار رہی تھی بولی ”میرا پاؤں الٹ گیا ہے“

عورت چند لمحے اس کا پاؤں دیکھتی رہی پھر گویا ہوئی ”فکر نہ کرو۔ میں بڑی اعلیٰ قسم کی مرہم لے کر آتی ہوں۔ تم مرہم لگانے کے بعد بہت سکون محسوس کرو گی“

”شکریہ۔۔۔۔۔۔“ صہف نے کہا۔

عورت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی دروازے سے باہر نکل گئی۔

”چلو اچھا ہوا۔۔۔۔۔۔“ موہین کرسی میں پھلتے ہوئے بولی ”تھوڑی دیر آرام کر لیں گے صہف کی چوٹ کی وجہ سے“

”ہاں تھک تو ہم لوگ بھی گئے تھے“ سیبہ اور شام نے کہا۔

”لیکن ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں رکنا“ واسقہ بولا۔

”بھئی مرہم تو آ لینے دو۔۔۔۔۔۔“ صہف بولی

”سب باتیں کرنے لگے۔ کرسیوں میں دھنسا ہو کر نئی مزہ لے رہا تھا۔ جوڑ جوڑ چڑھائی چڑھنے سے دکھ رہا تھا۔۔۔۔۔۔“

پشتوں کے کوہان بھی کرسیوں کی پشت پر ڈال کر کچھ سکون کا احساس ہو رہا تھا۔

”کالی دیر کے بعد وہ عورت دروازے سے نمودار ہوئی اس کے ہاتھ میں مرہم کی کالی ڈبیہ تھی۔“

”لاؤ۔۔۔۔۔۔“ موہین نے ہاتھ بڑھایا ”میں صہف کے مرہم لگا دیتی ہوں“

”نہیں بھئی۔۔۔۔۔۔“ وہ عورت آگے بڑھی۔۔۔۔۔۔ اور جھک کر بیٹھتے ہوئے صہف کا پاؤں پکڑ لیا۔

صہف قدرے گھبرائی۔۔۔۔۔۔ کیونکہ چوٹ و وٹ تو کوئی تھی نہیں۔ اس نے تو آرام کرنے کے لیے بہانہ تراشا تھا۔

عورت نے کئی منٹ بیدار دیکھنے میں لگا دیئے اور پھر ڈھیر سا وقت اس کے پاؤں پر مرہم لگانے میں صرف کیا۔

بچے تو کرسیوں میں اوگھنے لگے تھے۔ موہین بھی سو گئی تھی۔ واسقہ البتہ بیدار تھا۔ اور اسے عورت کے اس طرح مرہم لگانے پر کچھ

غصہ بھی آنے لگا تھا۔

”بس محترمہ“ صہف نے اپنا پیرا کھینچ لیا۔ اب میں بہت بہتر محسوس کر رہی ہوں بہت بہت شکریہ“

صہف اب تھکان محسوس نہیں کر رہی تھی۔ کافی دیر آرام کر لیا تھا۔ اس لیے اس نے واسقہ سے بھی کہا ”اب میں ٹھیک

گیر جلدی سے قدم اٹھاتے ہوئے بولا ”اب ہمیں چلنا چاہیے“
”ہاں“ سب نے کہا۔

غفلت نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ سب دالان سے باہر نکل آئے باہر آ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ شام کے دھند لکے پھیل رہے تھے۔

”اوہ۔ یہ تو شام اتر رہی ہے“ رمیلہ چلائی۔

”اتنی دیر ہم نے یہاں لگا دی“ موہین حیرت سے بولی ”رات اترنے والی ہے“ دروازے میں کھڑے کھڑے غفلت مسکرائی اور بولی ”آپ لوگ ایسے غافل ہوئے کہ شام ڈھلنے کو آئی اور آپ کو احساس تک نہ ہوا“
”وہ بڑے تمسخر سے مسکر رہی تھی۔ اپنی کامیابی پر نازاں تھی۔

”چلو چلو اب۔۔۔۔۔۔ یہاں ایک منہ نہیں رکنا“ واسقہ جھلایا۔

”ہاں جلدی کرو خواہ مخواہ اتنا وقت ضائع ہو گیا“ موہین نے غصے سے صحن کی طرف دیکھا۔

گیر بولا ”ہم بالکل ہی بھول گئے۔ حالانکہ بی رحمدلی نے ہمیں اس سے بچنے کی تاکید کی تھی۔۔۔۔۔۔“

”اب پچھلی باتوں کو چھوڑو۔ پشیمائی سے کچھ نہیں ہوگا جلدی جلدی قدم اٹھاؤ اور غفلت کے علاقے سے نکل چلو۔۔۔۔۔۔“

واسقہ درشت لہجے میں بولا۔

سب نے بھاگنے کا انداز اختیار کیا۔

غفلت نے ایک تمسخرانہ قہقہہ لگایا۔

اور

دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی۔

شام کے دھند لکے پھیل رہے تھے۔ گھنے درختوں کی وجہ سے روشنی اندھی سی ہو رہی تھی۔ لگتا تھا کچھ اور اوپر گئے۔ تو سیاہ اندھیرا

پھیل چکا ہوگا۔ اور ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دے گا۔

سب متفکر نظر آ رہے تھے۔

”ناحق راستے میں رکے“ واسقہ بولا ”اس غفلت نے ہمیں اتنا نقصان پہنچایا کہ اب ہمارے لیے اس نیک آدمی کے گھرنیک پہنچنا مشکل ہو رہا ہے“

رمیلہ جو دھندلاہٹ سے خوفزدہ تھی اور بھائی کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے تھی پریشان ہو کر بولی ”اس نیک آدمی کا گھرا بھی کتنی دور ہوگا“

”وہ تو پہاڑ کی چوٹی پر ہے“ گیرو نے کہا۔

”اور پہاڑ کی چوٹی ابھی نظر نہیں آرہی“ واسقہ نے کہا۔

”فاصلہ کافی ہے“ صفحہ پریشان نظر آنے لگی۔

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔۔۔۔۔۔ واسقہ درشت لہجے میں بولا۔ ”نہ تمہیں چوٹ لگتی نہ ہم غفلت کے ہاتھ آتے“

صفحہ تنک کر بولی ”میں نے یہ تھوڑا کہا تھا کہ اس کے گھر تم ڈیرے ہی ڈال لو۔ مرہم لگوانے کے بعد سب کو اٹھ آنا چاہیے

تھا۔۔۔۔۔۔“

موہین مصالحت کے انداز میں بولی ”وہاں فضا ہی ایسی تھی کہ ہم سب غافل ہو گئے“

فریدوں طیش میں آ کر بولا ”مجھے اب غفلت نظر آئے تو اس کی گردن اڑادوں۔

”غفلت نے سارا پروگرام بگاڑ دیا“ گیرو بھی پچھتاوے کے انداز میں بولا۔

”رحمد لی کتنی اچھی تھی۔ اس نے ہمیں اس خبیث سے آگاہ بھی کیا تھا“ شاتم بولی۔

”ہرہم جان بوجھ کر تو وہاں نہیں رکے تھے۔ سیہہ بولی۔ ”صفحہ کی وجہ سے رکنا پڑا۔“

صفحہ کو غصہ آ گیا۔ لڑنے کے انداز میں چیخی ”سب مجھے ہی الزام دے رہے ہیں تم سب کی عقلیں گھاس چرنے گئی تھیں۔

جلدی اٹھ آتے نا۔۔۔۔۔۔ ناگمین پساہ کے سب پڑ گئے تھے۔ اور کھانے کے لیے کتنے بے چین تھے۔۔۔۔۔۔“

”ہاں بھئی غلطی ہم سب کی ہے“ واسقہ صفحہ کا مزاج برہم ٹھنڈا کرنے کو بولا۔ ”سب پچھلی باتوں کو چھوڑ دو۔ اور اس سے نصیحت

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

پکڑو۔“

”واقعی غفلت بہت بری ہے“

”مجھے تو اس سے نفرت محسوس ہونے لگی ہے“

سب اپنے اپنے غمے کا اظہار کر چکے تو واسقہ نے کہا ”اب رات کی فکر کرنا چاہیے۔ رات کے اندھیرے میں چڑھائی چڑھنا مشکل ہے“

”واقعی.....“ فریدوں کچھ سوچتے ہوئے بولا ”یہاں تو راستہ بھی تنگ ہے موڑ بھی ہیں اور درختوں میں چڑھائی چڑھنا مشکل ہے۔“

”واقعی-----“ فریدوں کو کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”یہاں تو راستہ بھی تنگ ہے موڑ بھی ہیں اور درختوں کی بھی بہتات ہے۔“ پھر کیا کریں؟“

”چوٹی ابھی دور ہے آدھی رات تک بھی سفر کریں تو میرے خیال میں وہاں نہیں پہنچ سکتے۔“
”پھر کچھ سوچنا چاہیے۔ مجھے تو ابھی سے ڈر لگ رہا ہے“ رمیلہ نے کہا۔

”ڈرنے کی بات تو ہے ہی“ سیبہ بولی ”دیکھو تو ارد گرد کتنے کھڈے ہیں پاؤں پھسلے تو دھڑام سے نیچے گریں“
”اندھیرے میں جو کوئی جنگلی جانور حملہ آور ہو گیا..... تو.....“ شاتم نے لرز کر کہا۔

”ایسی ڈراؤنی باتیں مت کرو“ گیرو نے ان تینوں لڑکیوں کو ڈانٹا..... وہ تینوں چپ گئیں۔ لیکن ایک دوسری کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔

چند قدم اور چلے۔ تو موہین نے کہا ”بھی رات گزارنے کے لیے کوئی ٹھکانہ تلاش کرو۔ میرے تو پاؤں زخمی ہو گئے ہیں۔ میں بہت نقاہت محسوس کر رہی ہوں۔ اور یہ پشت کا بوجھ بہت اذیت دے رہا ہے“

”وہ تو ہم سب اٹھائے ہوئے ہیں“ فریدوں نے کہا۔

”تمہارے بوجھ ہلکے ہیں.....“ موہین ناگواری سے بولی۔ ”مجھ سے یہ گٹھڑاٹھا کر اب نہیں چلا جا رہا.....“

”حالت تو میری بھی تم ایسی ہے۔“ صنف بولی۔ ”لیکن مجبوری ہے کیا کیا جائے۔“

”میں ادھر ادھر اسی لیے دیکھ رہا ہوں کہ شاید کہیں کسی گھر کی روشنی نظر آ جائے واسقہ بولا۔

”روشنی! رمیلہ شاتم سے ہاتھ چھڑا کر واسقہ کے پاس آتے ہوئے چلائی۔

”ہاں“ وہ بولا۔

”وہ تو میں نے ابھی دیکھی ہے ان درختوں کے پیچھے آؤ میرے ساتھ میں تمہیں دکھاؤں شاید وہ کسی گھر ہی کی روشنی ہو“

”کہاں دیکھی ہے“ گیسو نے پوچھا۔

”ادھر“ اس نے دائیں ہاتھ اشارہ کرتے ہوئے سب سے کہا ”آؤ تم لوگ خود بھی دیکھ لو.....“

سب پلٹ کر اس طرف آئے جس طرف رمیلہ نے روشنی دیکھی تھی۔ واقعی وہاں روشنی تھی۔ غالباً کوئی گھر تھا۔ جس کی کھڑکی سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ صحن موہن تو بچوں کی طرح خوشی سے تالیاں بجانے لگیں۔

”چلو چلتے ہیں شاید کسی کا گھر ہے۔ اس پہاڑ پر رہنے والے لوگوں کی عادت ہے کہ مسافروں کو پناہ دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ آدی جس کا گھر روشن ہے ہمیں رات گزارے کو جگہ دے دے“ واسقہ نے کہا۔

”نہ بھی دے“ فریدوں بولا ”ہمیں کسی سرانے وغیرہ کا پتہ تو بتا دے گا جہاں ہم رات گزار سکیں گے۔“

سب تیز تیز قدم اٹھاتے اس گھر کی طرف بڑھے۔ جو اونچے اونچے درختوں میں ہوا تھا۔ جس کی حالت اچھی تھی۔ اور بڑی سنہری اور چمکیلی روشنی کھڑکی سے باہر آ رہی تھی۔

اس گھر کے پیچھے اور بھی چند گھر تھے۔ غالباً یہ بھی کوئی بستی تھی۔ لیکن اور گھروں میں اتنی روشنی نہیں تھی۔ کچھ گھر تو تاریکی میں ڈوبے تھے۔ وہ سارے گھر شاید غریبوں کے تھے۔

لیکن

یہ گھر بڑا پرکشش تھا۔ کسی نے بھی کسی دوسرے گھر میں جانے کا نہیں سوچا۔ سب واسقہ کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتے اسی گھر کی طرف چل دیئے۔ جس کا لکڑی کا خوبصورت دروازہ بند تھا۔ لیکن دروازے کے نقش و نگار اور پیتل کے کنڈے چمک رہے تھے۔

واسقہ نے آگے بڑھ کر دستک دی۔

”کون؟“ آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا ایک نائے قد کا موٹا سا آدمی تھا۔ جس کا سر گنجا تھا۔

گال سرخ تھے۔ اور آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔

وہ ان لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ اسی لیے استقبالیہ انداز میں سر جھکاتے ہوئے بولا ”آئیے تشریف لائیے۔ میرا گھر حاضر

ہے۔“

سب اس کی شکل و صورت سے ہم گئے تھے۔ لیکن اس کے انداز گفتگو سے سب متاثر ہوئے۔ بچے تو خوش نظر آنے لگے۔

سب آگے پیچھے اندر داخل ہو گئے۔ یہ گھر اندر سے بھی خوبصورت اور پر آسائش تھا۔ قالین بچھے تھے۔ اور خوبصورت فرنیچر پڑا

تھا۔ فانوس روشن تھے۔ اندھیرے کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

وہ انہیں ایک بہت بڑے گول کمرے میں لے آیا۔ یہاں کی ہر چیز دیدنی تھی۔ بہت ہی آرام دہ کرسیاں بچھی تھیں۔ فرش سرخ قالین سے ڈھکا تھا۔ میزوں پر گلدان رکھے تھے۔ کونوں میں بڑے بڑے آرائشی مجسمے تھے۔

سب بیٹھ چکے تو میزبان مسکرا کر دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ بڑی پراسرار اور عجیب سی تھی۔ رمیلہ نے تو سہم کراپنا سر شاتم کے کندھے پر رکھ کر آنکھیں بند کر بولیں۔

”آپ لوگ رات گزارنے یہاں آئے ہیں.....“ میزبان کے گول گول گال کچھ اور سرخ نظر آنے لگے۔

”جی.....“ واسقہ نے کہا۔

”بہد شوق..... مجھے آپ کی میزبانی پر فخر ہے“

”شکریہ“

میزبان بڑے پراسرار انداز میں مسکرا رہا تھا۔ مسکرا بھی کیا لگتا تھا۔ اس کے انگ انگ سے تمسخرانہ ہنسی پھوٹ رہی ہے۔

اتنا اچھا گھر اور خوبصورت ہال ہونے کے باوجود سب کچھ بے چینی سی محسوس رہے تھے۔ جی چاہ رہا تھا کہ یہ میزبان یہاں سے چلا جائے یا یہ سب یہاں سے رخصت ہو جائیں۔ مگر وہ مسکراہٹ سب کو برداشت کرنا مشکل ہو رہی تھی۔

لیکن

کیا کرتے

مجبوری تھی۔ رات تو کسی نہ کسی طور یہاں بسر کرنا ہی تھی۔

”میں آپ لوگوں کے لیے بستر لگواتا ہوں“ میزبان اٹھتے ہوئے بولا ”اور کھانے بھی بندوبست کرتا ہوں“

وہ اٹھ کر چلا گیا۔ تو سب نے جیسے سکون کا سانس لیا۔ بچے اٹھ کر ہال میں چیزیں دیکھنے لگے واسقہ موہین اور صف بھی باتیں کرنے لگے۔

”ہمارا میزبان اچھا ہی آدمی لگتا ہے۔ جو ہمارے لیے بستر لگوانے گیا ہے۔ بولا۔

”اور کھانے پینے کا بھی بندوبست کرے گا“ موہین بولی۔

”پر پتہ نہیں کیوں اس کی موجودگی میں ماحول کچھ ناخوشگوار سا لگ رہا تھا مجھے صف بولی ”ہاں شاید اس کی شکل ہی ایسی ہے“

واستقہ بولا۔ ”دل کا برا نہیں“

”واقعی“

سب باتیں کرنے لگے۔ میزبان نے ان سب کے لیے پر تکلف کھانا بھجوایا۔ سب نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔

میزبان بڑے اصرار سے ان کو پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اب سب بے تکلف ہو گئے تھے۔ اور اس کی مسکراہٹ سے کوئی سہم بھی نہیں رہا تھا۔

”میں نے آپ لوگوں کے بستر پلنگوں پر دوسرے ہال میں لگوا دیئے ہیں.....“ وہ بولا۔

”بہت بہت شکریہ.....“ واستقہ بولا۔

”ہائے مجھے تو یوں لگتا ہے برسوں بعد پلنگ پر سونا نصیب ہوگا“ موہین اترا کر بولی ”میں نرم اور پر آسائش بستر پر سونے کی عادی

ہوں“

”میں خود“ صاف شان سے بولی۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اپنے پر آسائش گھروں کو چھوڑ کر اس اندھیری بھیا تک رات میں کہاں جا رہے تھے۔“ میزبان

نے چھوٹی چھوٹی چمکتی آنکھوں سے واستقہ کی طرف دیکھا۔

ہماری منزل ”مستوں کا شہر ہے۔“ واستقہ نے کہا اور پھر اپنے پشتوں پر لدے بوجھوں کی کہانی مختصر الفاظ میں اسے سنا دی۔

میزبان نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں حیرت سے پھیلاتے ہوئے کچھ سہمے سے انداز میں کہا ”آپ لوگ مستوں کے شہر جا

رہے ہیں“

”ہاں.....“ کیوں جلدی سے موہین نے پوچھا۔

”آپ لوگ اتنے خطرناک اور بھیا تک سفر پر نکلے ہوئے ہیں“ میزبان نے دڑکا اظہار کیا۔

”کیا مطلب؟“ صاف نے پوچھا۔

”بھئی آپ لوگ جانتے ہی نہیں.....“ وہ بولا۔

”کیا موہین بے تابانی سے بولی۔“

”کہ پہاڑ کتنا ویران اور خطرناک ہے۔ ارد گرد جنگل ہی جنگل ہیں اور ان میں ایسے ایسے ہیبت ناک جانور اور زہرناک اژدھے

ہوتے ہیں کہ دن کے قت ادھر سے گزرنا آسان نہیں ہوتا
 ”ہائے“ موہین ڈر سے سپید پڑ گئی۔

”اور“ میزبان بولے گیا ”جا بجاتی گہری کھائیاں ہیں کہ ذرا پاؤں غلط پڑا اور بندوق غائب“
 ”اف.....“ سب کے رنگ اڑ جا رہے تھے۔ بچے ایک دوسرے سے چٹ گئے۔

”اور تو اور“ وہ اسی لہجے میں بولا ”کوئی مصیبتوں کا مارا یہ پہاڑ طے کر بھی لے۔ دوسری طرف راستہ اس سے بھی زیادہ خطرناک
 ہے۔ راستے میں جگہ جگہ ایسی پریشانیوں سے واسطہ پڑتا ہے کہ توبہ توبہ..... انسان ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔

سب ڈر کے مارے کانپ رہے تھے۔ سب سے برا حال موہین کا تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

جب میزبان کی باتیں اس کی برداشت سے باہر ہو گئیں۔ تو وہ ایک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور خوفزدہ لہجے میں بولی ”میں تو نہیں
 جاؤں گی۔ مجھے اپنی جان یوں گنوانا منظور نہیں یہ بوجھ پشت پر ہے تو رہے گزارہ ہو ہی جائے گا۔ میں آگے نہیں جاؤں گی“
 ”موہین.....“ واسقہ نے اسے تسلی دینا چاہی۔

لیکن

وہ قدم اٹھاتے ہوئے بولی ”میں واپس جاؤں گی۔ میں واپس جاؤں گی“

اور

ڈر سے کانپتی شاتم نے موہین کا بازو تھام لیا اور بولی ”میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں“

”شاتم“ فریدوں نے بہن کو ڈانٹا اور آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام کر ساتھ لگائے ہوئے بولا..... ”تم نہیں جاؤ گی۔ میں نے
 پہلے بھی کہا ہے کہ ہم لوگ بات بات پر مظاہرہ کرتے رہے تو منزل تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ ہمیں بہر صورت مسرتوں کے شہر جانا
 ہے خواہ کتنی مصیبتیں بھی نہ جھیلنا پڑیں۔

فریدوں کی باتوں سے سب کا حوصلہ بندھا۔

لیکن

موہین خوفزدہ ہو کر وہاں سے بھاگ لی تھی۔ میزبان نے بھاگنے میں اس کی مدد کی تھی فریدوں نے سب سے کہا ”حوصلہ رکھو۔

ہمت نہیں ہارو

”میری مانتو تو بچو“ میزبان نے پھر پراسرار انداز میں کہا ”آپ لوگ بھی واپس چلے جائیں۔ اپنی جانیں خطرے میں نہ ڈالیں۔ آپ کی ساتھی نے عقلمندی سے کام لیا ہے۔ جو وہ واپس چلی گئی ہے۔

واستفہ کچھ کہنے ہی کو تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

”اور شاید موہین واپس آگئی.....“ شاتم اور سیہ نے بیک زبان کہا۔

لیکن

وہ موہین نہیں تھی۔

وہ

تو

کشت یار تھا۔

کشت یار کو دیکھ کر سب کے چہروں پر رونق آگئی۔ رمیلہ تو آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئی۔ اس گھگھاتی ہوئے بولی ”اچھا ہوا جو آپ آگئے۔ موہین تو ہمیں چھوڑ کر چلی گئی“

”کہاں گئی موہین“ کشت یار نے حیرت سے پوچھا۔

”واپس“

”کیوں“

واستفہ نے مختصر سے بتایا کہ میزبان کے راستے کے خطرناک سے آگاہ کرنے پر وہ گھبرا کر واپس ہوئی۔

کشت یار نے غور سے میزبان کو دیکھا۔ مزید بیان پراسرار انداز میں مسکرارہا تھا۔

کشت یار بھانپ گیا۔ سر ہلایا اور ہولے سے کہا ”اب سمجھا“

اسی لیے وہ سب سے بولا ”چلو چلو۔ اٹھو۔“

”اجی کہاں جائیں گے آپ؟“ میزبان بولا ”رات تاریک اور پہاڑویران ہے۔ جا بجا جنگلی جانور چیر پھاڑ ڈالنے کو۔ سانپ

اڑدھے ڈس لینے کو.....“

وہ بولے گیا۔ لیکن کشت یار سنی ان سنی کرتے ہوئے سب کو باہر نکلنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ کشت یار کے کہنے پر سب منہ لٹکائے باہر

نکلنے لگے۔

میزبان انہیں پھر بھی ڈراتا رہا۔ وسوسے ڈالتا رہا۔ وہم میں مبتلا کرتا رہا

لیکن

جب

کشت یار نہر کا

تو وہ کندھے اچکاتے اور آنکھیں چندھیاتے ہوئے بولا ”جیسے تم لوگوں کی مرضی“

وہ سب باہر نکلے

تو

دیکھ کر حیران رہ گئے کہ پر نور چاندنی کا غبار پھیلا ہوا تھا۔ ہر چیز نظر آ رہی تھی۔ درخت بے حد خوبصورت لگ رہے تھے ہوائیں

چل رہی تھیں۔ اور راستہ سیدھا اور ہموار تھا۔

”باہر تو سب کچھ ٹھیک ہے“ شاتم خوش ہو کر بولی ”میزبان ہمیں خواہ مخواہ ہی خوفزدہ کر رہا تھا“

کشت یار نے سب کی طرف دیکھا اور بولا ”جانتے ہو وہ کون تھا؟“

”کون“ سب بولے۔

”شک“

سب چیخ اٹھے ”شک؟“

”ہاں۔ وہی شک جس کے ہاں رکنے سے رحمہ لی نے تم سب کع منع کیا تھا۔“

”اوہ.....“ واسقہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا..... ”اسی وجہ سے وہ ہمیں خطرات سے ڈرا رہا تھا۔ ہمارے دلوں میں وسوسہ

اور وہم ڈال رہا تھا۔ جھوٹ بول کر“ شک کا تو کام ہی جھوٹ بولنا ہے“ کشت یار بولا۔

”ہاں واقعی۔ کتنا خوبصورت سماں ہے“

”نہ جانور ہیں اور نہ کیڑے مکوڑے۔“

”کھائیں اور کھنڈ بھی نہیں ہیں“

”ہائے ہائے موہین خواہ مخواہ ہی ہمیں چھوڑ کر چلی گئی“

”میں وقت پر پہنچ جاتا تو موہین کو روک لیتا۔ وہ شک کا شکار ہو گئی“

سب کو موہین کے واپس چلے جانے کا بہت ہی افسوس تھا۔

چاندنی کا نور ہر سو پھیلا ہوا تھا۔ اور اس کے اجلے اجلے میں وہ صاف اور سادہ عمارت نظر آ رہی تھی۔ جو پہاڑ کی چوٹی پر تھی..... رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی لیکن کشت یار کے ساتھ سب ساتھی اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ موسم خاصہ خنک ہو رہا تھا۔

عمارت دیکھ کر سب سے پہلے رمیلہ خوشی سے چلائی ”وہ..... وہ دیکھو۔ وہ چوٹی جو گھر نظر آ رہا ہے یقیناً اسی نیک آدمی کا ہے جس کے متعلق بی رحمہ لی نے بتایا تھا۔“

”ہاں ہاں بے شک وہی ہے رہبر کا گھر“ کشت یار خوشی سے بولا۔

”تو ہم نے پہاڑ کی چڑھائی سر کر ہی لی آخر“ واسقہ نے کہا۔

”بے شک یہ گھر ہماری منزل نہیں“ کشت یار بولا۔ لیکن یہ نیک آدمی رہبری کرے گا۔ تو ہم مسرتوں کے شہر آسانی سے پہنچ جائیں“

”خدا کرے ایسا ہو.....“

”ضرور ہوگا.....“

اب وہ سب اس کھلے میدان میں پہنچ گئے تھے۔ جو پہاڑ کی چوٹی پر واقعی تھا۔ جس میں وہ سادہ سی مگر صاف ستھری عمارت اک وقار سے کھڑی تھی۔

”آدھی رات ہو چکی ہے“ کشت یار نے ستاروں بھرے آسمان کی طرف اندازہ لگایا۔

”ہاں“ صہف بولی۔

”کیا ہمیں آدھی رات کو اس نیک آدمی کے دروازے پر دستک دینا چاہیے“

واسقہ بولا۔ ”اخلاقاً تو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ نیک آدمی اس وقت گہری نیند سو رہا ہوگا۔“

”تو کیا ہم اس میدان میں کھلے آسمان تلے باقی رات گزاریں گے“ صغفہ بد مزاجی سے بولی۔

”ہم لوگ تھکے ہوئے ہیں۔ بھوکے پیاسے بھی ہیں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ دروازہ کھٹکھٹائیں۔ وہ نیک آدمی ضرور ہے کہ شب

بیدار بھی ہوگا۔ ایسے بزرگ رات رات بھر جاگ کر عبادت کرتے ہیں“

”ہاں سنا تو میں نے بھی یہی ہے۔ لیکن اپنے شہر میں تو ایسا کوئی نہیں تھا“ اب اس بحث کو چھوڑو..... اور دروازہ کھٹکھٹاؤ“

صغفہ نے تند لہجے میں کہا۔

”اچھا“ فریدوں نے کہا ”میں دروازے پر دستک دیتا ہوں“

فریدوں نے قدم آگے بڑھائے اور لکڑی کے بڑے سے صدر دروازے پر لگی سنہری زنجیر سے دروازہ کھٹکھٹایا

چند لمحوں بعد ہی دروازہ کھل گیا۔

اور

سفید بے داغ لبادے میں ملبوس ایک نورانی صورت باریش آدمی نے دروازہ کھول دیا..... اور بولا ”میں رہبر ہوں میرے

بچے اندر آ جاؤ.....“

فریدوں تعظیم سے بولا ”میرے ساتھ میرے اور بھی ساتھی ہیں“

باریش بزرگ نے شفقت اور محبت سے مسکرا کر کہا..... ”بلا لوسب کو۔ میرا گھر حاضر ہے“

”شکریہ“ فریدوں کے لبوں سے از خود نکل گیا۔ ایک لمحہ کو اسے اپنے آپ پر حیران بھی ہوئی۔ وہ کتنا اکھڑ بد تمیز اور بد فطرت ہوا

کرتا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے پہنچتے اس کے کردار اور مزاج میں حیرت انگیز تبدیلیاں آ چکی تھیں۔

وہ واپس پلٹا۔

اور

اپنے سب ساتھیوں کو لے کر آ گیا۔

بزرگ نے بڑے پیار سے سب کا استقبال کیا

اور انہیں گھر کے اندر لے آیا۔

اس نیک آدمی کا گھر بڑا صاف ستھرا اور پاکیزہ تھا۔ گوامارت اور تزئین کی بظاہر چیزیں نہ تھیں۔ پھر بھی گھر کی فضا بہت مقدس اور

خوشگوار تھی۔ پاکیزگی اور طہارت کا احساس بڑا جاندار تھا۔

رہبر انہیں ایک صاف ستھرے کمرے میں لے آیا۔ جہاں زمین پر چاندنی بچھی تھی اور دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے لگے تھے۔

سب نے اپنے جوتے دروازے سے باہر اتارے اور آ کر گاؤ تکیوں کے سہارے چاندنی کے فرش پر بیٹھ گئے۔ یہاں انہیں بے حد سکون ملا۔ جسم تو تھکے ہوئے تھے ہی۔

میرے بچو۔ تم لوگوں نے یقیناً کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہوگا۔ تھوڑی دیر تم لوگ سستاؤ۔ میں تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کو لے آؤں۔“

آدھی رات اس بزرگ کو تکلیف دینا کسی کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”بیچارے رہبر کو اس وقت ہم تکلیف دے رہے ہیں.....“

”پتہ نہیں اس گھر میں اتنے لوگوں کے لیے کھانا ہوگا بھی یا نہیں.....“

”اگر اسے اکیلے کو کھانا بنانا پڑا تو.....“

”بہتر ہوتا ہم باقی رات باہر ہی گزار لیتے۔“

سب بزرگ کو تکلیف دینے پر شرمندہ اور نادام تھے۔ اور یہ مزاجوں کی تبدیلی تھی جو انہیں یہ احساس دلانا ہی تھی۔ ورنہ اپنے شہر میں کسی نے کب اس انداز سے کبھی سوچا تھا۔ اس حیران کن مزاجی تبدیلی کو سب ہی محسوس کر رہے تھے۔ کشت یار جیسا ظالم و جابر شکس واسقہ جیسا مکار اور فریبی آدمی اور صحن جیسی تنگ مزاج اور درشت طبیعت کی عورت سب اتنا بدل چکے تھے۔ اور تو اور بد تمیز اور آوارہ صفت بچے بھی حد تک سدھر چکے تھے کہ کسی کو تکلیف دے کر خوش نہیں ہو رہے تھے۔ کوفت محسوس کر رہے تھے کچھ زیادہ دیر نہیں گزری۔

رہبر ان سب کے لیے دو خوان کھانے سے بھر کر لے آیا۔

سادہ روٹیاں اور سالن ہی تھا جو اس نے پیار سے سب کو پیش کرتے ہوئے کہا ”جو کچھ گھر میں تھا وہ حاضر ہے۔ آپ لوگ نوش

فرمائیں“

”آپ کو تکلیف دی.....“ ہم سب نادام ہیں“ کشت یار بولا۔

”مہمان خدا کی رحمت ہوتے ہیں۔ آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ کھانا پیٹ بھر کر کھائیں۔ میں پانی لے آؤں“

سب کھانا کھانے لگے۔ اس کھانے نے انہیں اتنی لذت دی کہ کھاتے ہی چلے گئے۔ لگتا تھا ایسا لذیذ کھانا وہ زندگی میں پہلی بار کھا رہے ہیں۔

رہبر پانی اور کٹورے بھی لے آیا۔

سب نے شیریں پانی پی کر خدا کا شکر یہ ادا کیا۔

”میں نے بستر بھی لگا دیئے ہیں۔ تاکہ آپ آرام سے سو سکیں“ رہبر بولا۔

”ہم یہیں سو جاتے کافی آرام وہ جگہ ہے آپ نے بستر لگانے کی ناحق تکلیف کی“

کشت یار نے کہا۔

رہبر زیر لب مسکرایا اور بولا۔ ”آپ اپنی کمروں کی بوجھ کی وجہ سے یہاں ٹھیک طرح سے آرام نہیں کر سکیں گے“

سب شرمندہ سے ہوئے نادم ہو کر گردنیں جھکا لیں۔

”کوئی بات نہیں..... کوئی بات نہیں“ رہبر نے شفیق لہجے میں کہا۔

کشت یار نے خود ہی مختصر الفاظ میں اپنی روئیداد سے سنا دی۔

رہبر نے ہولے ہولے سر ہلایا۔

اور

بولا

”میں جانتا ہوں۔ وہ میرا بھائی ہے۔ جس نے آپ لوگوں کے ذہنوں میں بھرے گناہوں کے بوجھ ظاہر کر دیئے۔ اور اس نے

یہ بوجھ اتارنے کا بھی آپ کو صحیح مقام بنایا ہے۔ وہاں پہنچ کر آپ کے یہ بوجھ غائب ہو جائیں گے“

صحف بڑبڑائی ”وہاں پہنچنا کونسا آسان ہے۔ جانے ابھی کتنی کٹھنائیوں سے اور گزرنا پڑے“

رہبر نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا ”رات بہت جا چکی ہے۔ اب آپ لوگ آرام کریں۔ صبح باتیں کریں گے“

”جی اچھا“ سب نے کہا۔

”آئیے میں آپ کو سونے کے کمرے تک پہنچا دوں“

سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ کھانا کھانے سے جسم میں توانائی آگئی تھی۔ سب تازہ دم ہو گئے تھے۔

رہبر انہیں وہاں سے اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے آیا۔ یہ کمرہ نسبتاً کشادہ تھا۔ صاف ستھرے بستر پلنگوں پر بچھے تھے۔ ان پلنگوں پر نیکیے اس انداز سے رکھے تھے کہ پشتوں کے بوجھ کے باوجود یہ لوگ چت بھی لیٹ سکتے تھے۔ سب ایسے نیکیے دیکھ کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوئے۔

سب بستروں پر لیٹ گئے۔ آج تو کشت یار نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ سادہ سے کمرے میں سادہ سا بستر ہی نعمت لگا۔ رہبر چند لمحے ان سے باتیں کرتا رہا

نیند سب پر غلبہ پارہی تھی۔ آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ اور لگتا تھا۔ سکون کی رنگین و حسین وادیوں میں وہ اترتے چلے جا رہے ہیں۔

جب وہ سو گئے۔

تو

رہبر نے آہستگی سے درازہ بند کیا۔

اور

واپس اپنی عبادت گاہ میں چلا گیا۔

بچے ناشتے کے بعد کافی دیر سرسبز میدان میں گھومتے پھرتے رہے۔ بڑے بھی اٹھ کر گاؤں کیوں والے میدان میں آ بیٹھے۔ انہوں نے جی بھر کر نیند نکال لی تھی۔ ناشتہ بھی کر لیا تھا۔ اس لیے تازہ دم ہو گئے تھے۔

”اب ہمیں چلنا چاہیے“ کشت یار نے کہا۔

”ہاں“ فریدوں باہر سے آ کر بولا ”بڑی چمکیلی صبح نکلی ہے۔ لگتا ہے ہر چیز سونے کی بنی ہے۔ چمک دک دیدنی ہے۔ سفر بہت اچھا رہے گا“

”ویسے بھی اب اترائی ہے۔ ہم بہت جلد پہاڑ کے دامن میں جا پہنچیں گے“ شاتم بھی اندر آ کر بولی۔

رمیلہ سیہ اور گیرو بھی اندر آ گئے۔ سب تروتازہ تھے۔ میدان میں صاف ستھری فضا میں گھومنے پھرنے سے ان کے چہرے شگفتہ نظر آ رہے تھے۔ لگتا تھا پشتوں کے کب بھی انہیں زیادہ تکلیف نہیں دے رہے۔

”بچے کتنے تازہ دم ہیں“ کشت یار نے کہا۔ بچے اسے کبھی اچھے نہیں لگے تھے۔ لیکن آج وہ انہیں دیکھ کر خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ چلنے کی تیاری کر کے اٹھے۔ تو بزرگ اندر آ گیا۔

”اجازت دیجئے محترم بزرگ کہ ہم اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں“ کشت یار نے کہا۔

”ضرور..... ضرور.....“ وہ بولا ”ابھی تمہارا کافی سفر باقی ہے“

”بابا“ رمیلہ نے پوچھا ”سرتوں کا شہر ابھی کتنی دور ہے؟“

بزرگ مسکرا کر بولا۔ ”باہر آؤ میں تمہیں دکھاتا ہوں“

”وہ سب بزرگ کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر نکل آئے۔ بزرگ میدان کے سرے پر آن کر رک گیا اور ایک سمت ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا ”وہ..... وہ رہا سرتوں کا شہر.....“

”وہ جو انتہائی روشن اور چمکدار نظر آ رہا ہے؟“ صصف نے جلدی سے پوچھا ”ہاں.....“

”لیکن وہ تو ابھی کافی دور دکھائی پڑتا ہے“ صصف نے منہ بنایا۔

”ہے تو.....“ کشت یار بولا.....“ لیکن ہے کتنا خوبصورت۔ مقناطیسی کشش ہے اس میں۔ میرا توجہ چاہ رہا ہے اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں“

”ہمت اور حوصلے سے سفر جاری رکھا تو ضرور پہنچ جاؤ گے“ بزرگ بولا۔

”ہم منزل پر پہنچ کر ہی دم لیں گے“ فریدوں نے سینہ تان کر کہا۔ ”صصف فاصلے کا خیال کر کے کچھ دل گرفتہ سی ہو گئی.....“

”یہاں سے تمہارا شہر بھی نظر آتا ہے“ برگ نے بچوں سے کہا۔

”واقعی“ بچے بڑے سبھی تجسس سے بولے ”دکھاؤ نا ہمیں وہ کدھر ہے“

بزرگ نے دوسری طرف رخ موڑا اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ”وہ وہ دیکھو..... وہ ہے تمہارا شہر“

”وہ..... جن پر سیاہ بادل چھائے ہیں“ رمیلہ بے اختیار انداز فرودگی سے کہہ اٹھی۔

”ہاں وہی“

”شہر تو نظر ہی نہیں آتا۔ اتنا تاریک اور ویران ہے“ شاتم سہم گئی۔

”یہ ہمارا شہر ہے.....“ سیبہ رو ہانسی ہو کر بولی۔ ”اتنا خراب“

”ہاں“

”اس کے اوپر اتنا دھواں کیوں ہے۔ سیاہ بادل کہاں سے آئے ہیں“ کشت یار پریشانی سے بولا۔

”گناہ کے بادل؟“ گیر بولا۔

”اتنے گھنیرے اور تاریک“ واسقہ بڑبڑایا۔

”ہاں میرے بچو“ بزرگ نے افسردگی سے کہا ”تمہارے شہر میں لوگ جب بھی گناہ کرتے ہیں وہ دھواں بن کر ان بادلوں میں

شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ بادل دن بدن گھمبیر ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ دیکھو کتنے ہی گھروں سے دھواں اٹھ رہا ہے“

سب نے ادھر دیکھا۔ شرمندگی سے ان کے سر جھک گئے۔ کئی گھروں سے دھواں اٹھ اٹھ کر بادلوں میں شامل ہو رہا تھا۔

”گناہ اسی طرح ہوتے رہے تو عجب نہیں یہ پورا شہر بالکل ویران ہو کر تاریکی میں ڈوب جائے“ رہبر بولا

سب بے حد شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔

”بیٹا“ بزرگ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا ”بالکل اسی طرح جس طرح گناہ تمہارے ذہنوں میں تھے۔ تو تمہیں پتہ نہیں چلتا

تھا۔ پر جب یہ تمہاری پشتوں پر ظاہر ہو گئے تو تمہیں اور سب کو نظر آنے لگے“

ندامت اور شرمندگی سے سب کا برا حال تھا۔

راہبر نے یہ بات دیکھی تو موضوع بدل کر بولا ”میں نے دو بندلوں میں تمہارے لیے کھانے پینے کا سامان باندھ دیا ہے۔ اب

شرمندہ ہونے سے فائدہ نہیں۔ فائدہ اسی میں ہے کہ تم لوگ سفر کی مصیبتیں اور کھٹنائیاں جھیلتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچ جاؤ۔ سب ٹھیک

ہو جائے گا..... جاؤ میرے بچوں..... خدا تمہاری مدد کرے گا“

وہ سب چلنے کو تیار تھے ہی۔ بزرگ سے کھانے کے بندل لیے اور اسے تعظیم سے سلام کرتے ہوئے جانے لگے۔

”سنو“ بزرگ نے انہیں روکا۔

”جی“

”میری چند باتیں سن لو“

”فرمائیے“

”ان باتوں کو یاد رکھنا نصیحتیں سمجھ کر بلے باندھ لینا.....“

”جی.....“

”ایک تو یہ کہ آپس میں لڑنا جھگڑنا نہیں“

”جی اچھا.....“ واسقہ نے صف کی طرف دیکھا جو خاصی لڑا کاتھی۔

”دوسرے“ بزرگ بولا ”جھوٹ کبھی نہیں بولنا۔ ہمیشہ سچ بولنا“

”اور؟“ کشت یار نے پوچھا۔

”اور سیدھے راستے پر چلتے جانا۔ خواہ اس راستے میں رکاوٹیں آئیں۔ یا مشکلیں سیدھے راستے سے ادھر ادھر نہیں ہونا“

”جی بہت اچھا“ فریدوں شاتم اور رمیلا نے بیک زبان کہا اور کوئی بھی کچھ نہیں بولا

”اب جاؤ“

”خدا حافظ“

”خدا حافظ“

بزرگ کی باتیں سب ہی نے سنی تھیں۔ لیکن فریدوں شاتم اور رمیلا ہی نے ان کو پلے باندھا۔ گیرا اور سپہ نے کوئی خاص دھیان

نہیں دیا۔

اور

کشت یار واسقہ اور صف تو شاید اپنے آپ کو منجھا ہوا سمجھتے تھے۔ نصیحتوں کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔

بہر حال

سب رہبر کو خدا حافظ کہہ کر چل پڑے

اب

وہ

اترائی میں جا رہے تھے۔ اس لیے راستہ جلدی کٹ رہا تھا۔

”یہ پہاڑ تو بہت ہی خوبصورت اور اترنے میں آسان ہے“ صف بولی ”وہ شک ہمیں خواہ مخواہ ہی وسوسے میں ڈال رہا

تھا.....“

”موجین اس کی باتوں میں آ ہی گئی نا“ کشت یار نے افسوس سے کہا۔

”میرا بس چلے تو جا کر اسے واپس لے آؤں“ صنف خوشگوار لہجے میں بولی تو فریدوں اور گیرو کے ساتھ واسقہ نے بھی تمسخرانہ قہقہہ لگایا۔

واسقہ بولا۔ ”شکر کرو خود یہاں تک پہنچ گئی ہو۔ واپس جاؤ گی۔ تو پھر واپس آنے سے رہی“

”کیوں..... میں اتنی کمزور ہوں کیا“ وہ غصے سے غرائی۔

”لڑنا نہیں لڑنا نہیں“ گیرو نے کہا ”بزرگ نے لڑنے سے منع کیا ہے“

سب ہنس پڑے صنف بھی مسکرائی۔

سب تیزی سے چلتے جا رہے تھے۔ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے۔ رمیلہ کو تو یوں لگ رہا تھا جیسے ہوا میں اڑتی چلی جا رہی ہے۔

”رمیلہ“ فریدوں نے اسے پکارا۔

”جی بھائی“

”اتنی تیزی سے مت بھاگو“

”کیوں“

”اترائی پر پھسلنے کا زیادہ خدشہ ہوتا ہے“

”ہاں رمیلہ“ شاتم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

باتیں کرتے ہنستے مسکراتے سب پہاڑ کی اترائی اتر رہے تھے۔ یہاں بھی درخت تھے گھنے اور چھتتار..... ہوائیں بھی مہک رہی تھیں۔ اور سونا بکھیرتی دھوپ کی تمازت بھی بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

دو پہر ہونے تک وہ پہاڑ کے دامن میں آچکے تھے۔ اب میدانی علاقہ شروع تھا۔ گویا ابھی غیر ہموار میدان تھا۔ پھر بھی پہاڑ جیسی

اترائی چڑھائی نہ تھی۔ میدان کچھ زیادہ سرسبز نہیں تھا کہیں کہیں گھاس کے قطعے تھے کہیں خود رو جھاڑیاں اور بیللیں بھی تھیں اور کہیں بالکل نکلی ٹیلیاں زمین تھی۔ جس میں کہیں کہیں چھوٹے بڑے سیاہ پتھر بے ترتیبی سے سمائے ہوئے تھے۔

موسم یہاں بھی خوشگوار ہی تھا۔

سارا قافلہ پہاڑ کو عبور کر چکا تھا۔ اس لیے سب بہت خوش تھے۔

”ایک مرحلہ تو ختم ہوا؟“ کشت یار نے کہا۔

”ہر مرحلہ کافی مشکل تھا“ واسقہ نے کہا۔

”ہمارے دو ساتھی ساتھ چھوڑ گئے“ صصف نے افسوس سے کہا۔

”مہیب نے تو شروع ہی میں ہمت ہار دی۔ موہین کا اس طرح دل چھوڑ دینا عجیب لگتا ہے.....“ کشت یار بولا۔

”وہ تو پتہ نہیں اتنا ساتھ بھی کیسے دے گئی۔ اتنے آرام و آسائش کی دلدادہ موہین سے توقع رکھنی فضول ہی تھی“ واسقہ بولا۔

”ہمیں کیا“ فریدوں نے کہا۔ ”ساری عمر پشتوں پر بوجھ لادے لوگوں کے تمسخر کا نشانہ بنتے رہیں گے“

”اچھا بھئی چھوڑو انہیں.....“ گیرو بولا۔ ”ہر کوئی اپنا اپنا سوچے“

”ٹھیک ہے“ سیہہ بولی۔

”تو پھر میں اپنا سوچ رہی ہوں“ شاتم خوش تھی۔

”کیا؟“

”کہ کہیں ٹھکانہ تلاش کیا جائے اور بیٹھ کر کھانا کھا جائے“

”بہت اچھا..... بہت خوب..... کی کام کی بات کی تم نے شاتم“ گیرو ”بھوک ہمیں بھی لگی ہوئی ہے“

”اور ہمیں بھی.....“ سب بولے۔

”کہاں بیٹھ کر کھائیں“ فریدوں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

”ہائے ہائے.....“ صصف بولی ”جگہ ڈھونڈ رہے ہیں وہ دیکھو کتنا چھتتا درخت ہے اور نیچے گھاس کا سبز فرش.....“

”واقعی ہمارا ادھیان تو ادھر گیا ہی نہیں۔ چلو سب ادھر چل کر بیٹھتے ہیں۔ بزرگ بابا کا دیا ہوا کھانا مزے سے کھاتے ہیں“

”چلو..... چلو..... چلو۔ سب اس طرف چل دیے۔

تھوڑی ہی دیر بعد درخت تلے سب دائرے کی صورت میں بیٹھے تھے۔ کھانے کا ایک بندل کھولا گیا تھا۔ دسترخوان بچھا کر اس

پر مزے مزے کے کھانے چن دیئے تھے۔ کمال کی بات کہ کھانا ابھی گرم تھا۔ اور بے حد لذیذ بھی۔ اچار چٹنیاں اور مرے بھی بابا نے

مختلف ڈبوں میں ڈال دیئے تھے۔ بھنا ہوا مرغ تو اتنا مزیدار تھا کہ سب کہہ اٹھے۔

خوب پیٹ بھر کر کھانے کے بعد بھی کچھ چیزیں بیچ گئیں۔ شاتم اور سیبہ انہیں سمیٹ ہی رہی تھیں کہ ان کو درخت کے پیچھے کھڑے اور چھپ چھپ کر کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھتے دو چہرے نظر آئے۔ وہ کھانے پینے کی چیزوں کو حریصانہ دیکھ رہے تھے۔

”کون ہو تم.....“ سیبہ کی نظر ان چہروں پر پڑی۔ جو سر نکال نکال کے درخت کے پیچھے سے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں ایک چہرہ لڑکی کا تھا دوسرا لڑکے کا۔ دونوں چہرے انتہائی کرخت اور مکروہ سے تھے۔ ان کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی لیکن انگاروں کی طرح لال تھیں۔ منہ سے رال ٹپک رہے تھے۔ پیشانیاں تنگ اور بال اکھڑے اکھڑے تھے۔

”کون ہو تم لوگ“ واسقہ کی نظر بھی ان پر پڑی“

صاف بولی ”کوئی غریب بچے ہیں.....“ پھر اس نے ناک منہ چڑھاتے ہوئے کہا بھوکے ہوں گے اسی لیے کھانے پر نظریں جمارکھی ہیں۔

کشت یا رہی ان کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے انہیں دیکھ کر کراہت سے منہ پھیر لیا اور شاتم سے کہا ”یہ بچا کھچا کھانا انہیں دے کر کہو یہاں سے دفعہ ہو جائیں۔“

شاطم نے کچھ کھانا ان کی طرف بڑھایا۔

وہ کھانے پر جھپٹ پڑے۔ اور بے صبری سے کھانا منہ میں ٹھونسنے لگے۔ کھانا اتنا تھا کہ دونوں سیر ہو سکتے تھے۔ لیکن وہ تو چند لمحوں میں سب کچھ ہڑپ کر گئے۔ اور پھر اس طرح حریصانہ نظروں سے کھانے کے اس بندل کو تھکنے لگے۔ جو بزرگ نے ان لوگوں کو دیا تھا۔ اور جسے رات کو استعمال کرنے کے لیے انہوں نے جوں کا توں رکھا ہوا تھا۔

”چلو بھاگو اب“ فریدوں نے انہیں ڈانٹا۔ تو وہ درخت کے پیچھے چھپ گئے۔

لیکن

تھوڑی ہی دیر بعد پھر جھانکنے لگے۔

”عجیب بچے ہیں.....“ صاف نے ناک منہ چڑھایا۔

”تم کون لوگ ہو۔ حد درجہ ڈھیٹ..... سنتے نہیں ہم لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔“

ہیں۔ دفعہ ہو جاؤ۔

لیکن

وہ پہلے کی طرح پھر درخت کے پیچھے چھپ گئے۔ اور چند لمحوں بعد پھر سر نکال نکال کر بندل کو تھکنے لگے۔

شاتم نے پہلے بندل کا باقی بچا کھچا کھانا بھی انہیں دے دیا۔ جسے وہ ایک سیکنڈ میں ہڑپ کر گئے۔

”تم انسان ہو یا جانور.....“ سیبہ نے تنفر سے انہیں دیکھا۔

”ہم.....“ لڑکا بولا۔ رال اب بھی اس کے منہ سے نپک رہا تھا۔

”ہاں کیا نام ہے تمہارا.....“ واسقہ نے پوچھا۔

”میرا نام لالچ ہے اور میری بہن کا نام طمع ہے“ لڑکا بولا۔

”اوہ..... اس نے کہا ”لالچ اور طمع۔ تمہیں ہم نے ڈھیر سارا کھانا دیا ہے اب اور کیا چاہتے ہو“

”کچھ نہیں..... کچھ نہیں“ طمع بولی ”ہم تو ویسے ہی دیکھ رہے ہیں آپ لوگوں کو.....“

”لیکن ہم تمہیں دیکھنا نہیں چاہتے“ گیر و سختی سے بولا ”بھاگو یہاں سے“

لیکن

”طمع اور لالچ بھاگنے کی بجائے آگے بڑھے اور جھپٹ کر کھانے کا بندل اٹھایا۔

پھر

یہ جا..... وہ جا۔

سب چیختے ہی رہ گئے۔ کشت یار نے دو تین گالیاں بکیں۔ فریدوں ان کے پیچھے دوڑا۔

لیکن

وہ تو جیسے ہوا کے دوش پر سوار تھے۔ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ فریدوں کا سانس پھول گیا اور وہ ہانپتا ہانپتا واپس لوٹ آیا۔

”نہیں ہاتھ آئے.....“ صحف نے پوچھا۔

”کیسے ہاتھ آتے۔ وہ لالچ اور طمع تھے۔“ فریدوں نے غصے سے کہا ”لالچی بھاگ گئے۔“

رمیلہ ہنس پڑی اور بولی ”لالچی تو وہ تھے ہی۔ نام ہی لالچ اور طمع تھا۔“

”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے“ فریدوں کو اپنی ناکامی کا غصہ تھا۔ رمیلہ کے یوں ہنسنے پر چڑ گیا اور اس بیچاری پر برس پڑا۔

”آئے ہائے رمیلہ بیچاری پر کیوں غصہ جھاڑ رہے ہو۔ پکڑ خود نہیں سکے“ گیرو نے تمسخر سے کہا تو فریدوں نے اس کا گریبان پکڑ

لیا، ”تم کہاں مرے تھے۔ جا کر پکڑ لیتے تا.....“

گیرو شوخی سے بولا، ”میں دیکھنا چاہتا تھا۔ تم رات کا کھانا ان سے واپس لا سکتے ہو نہیں“

”گیرو۔ اب تم نے کوئی بات کی تو میں تمہارا جبر اتوڑ دوں گا“

شاتم دسترخوان چھوڑ کر دونوں کے درمیان آ گئی۔ گیرو کا گریبان فریدوں کے ہاتھ سے چھڑایا اور بولی، ”فریدوں تم بزرگ بابا کی

بات ابھی سے بھول گئے۔ انہوں نے لڑائی جھگڑائے سے منع نہیں کیا تھا۔

”بری بات“ واستہ بھی بولا۔

تو

فریدوں شرمندہ ہو گیا۔ سر جھکاتے ہوئے بولا، ”معافی چاہتا ہوں۔ مجھے لالچ اور طمع کے بھاگ لینے کا غصہ تھا“

”غصہ تھوک دو.....“ کشت یار بولا..... ”افسوس تو ہے کہ ہمارا رات کا کھانا وہ دونوں لے اڑے۔ لیکن کوئی بات نہیں۔

رات آئے گی تو کچھ نہ کچھ بندوبست ہو ہی جائے گا“

”ہاں“ واستہ۔

”اب چلنا ہے یا تھوڑی دیر یہاں آرام کر لیا جائے“ صحف نے پوچھا۔

کشت یار نے کہا، ”ابھی پتہ نہیں ہم نے کتنا سفر طے کرنا ہے۔ مسرتوں کے شہر تک پہنچنے کے لیے.....“

”ابھی کچھ اندازہ نہیں“ فریدوں نے کہا۔

”تو پھر بہتر یہی ہے کہ تھوڑی دیر سستا کہ ہم لوگ یہاں سے چل پڑیں۔

”بالکل“

پھر سب چھتنا و درخت چلے بیٹھ گئے۔ صحف تو ایک مٹی کے تو دے پر کروٹ کے بل لیٹ گئی۔ بچے البتہ ادھر ادھر اچھلتے کودتے

پھرے۔

دو پہر ڈھل رہی تھی۔ سورج کی کرنیں اب آڑی پڑ رہی تھیں۔ پہاڑ کی نسبت اس میدان میں موسم زیادہ خوشگوار نہیں تھا کہیں

کہیں چشیل میدان تھا کہیں جھاڑ جھنکار تھے کہیں سوکھی سوکھی لمبی لمبی گھاس تھیں۔ اور کہیں کہیں سوکھے سوکھے بے سایہ درخت تھے۔ یہاں ان لوگوں کی رفتار کچھ ست پڑ گئی تھی۔ بچے تو موسم سے متاثر نہ تھے۔ اچھلتے کودتے دوڑتے بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ ہاں ادھر صاف بہت کوفت محسوس کر رہی تھی۔ کبھی تو وہ ڈھٹائی سے کھڑی ہو جاتی۔ لگتا آگے چلنے سے ابھی انکار کر دے گی۔

سفر ان لوگوں کو بہر حال جاری رکھنا تھا۔ صاف بھی بادل نخواستہ چل ہی پڑتی۔ دوپہر ڈھل گئی۔ سورج کو گولا مغرب کی آغوش میں جا لگا۔ مغربی سمت آسمان کے کنارے سرخ ہو گئی۔ اور شام کی سانولی دلہن اپنے آپچل پھیلا نے لگی۔ چرند پرند دن بھر کی تنگ و دوکے بعد اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹنے لگے۔

”یہاں آبادی کا تو دور دور تک کوئی نشان ہی نہیں“ صاف تھکن زدہ لہجے میں بولی ”آبادی کو کیا کرتا ہے“ واسقہ بولا۔

”کیوں؟“ کہیں رات نہیں گزارانی۔ مسلسل چلتے جانا ہے“ وہ بولی۔

”پتہ ہے رات کہیں گزارنی ہے“ واسقہ جھلایا ”ضروری تو نہیں کہ تم ہی یاد دلاؤ.....“

”میں تھک گئی ہوں.....“ وہ غصے سے بولی۔

”تو میں کیا تمہیں کندھوں پر اٹھا لوں“ واسقہ بھی غرایا..... ”ہمیشہ تم ہی پریشانی میں اضافہ کرتی ہو۔ ان بچوں ہی کو دیکھو۔ وہ بھی تو چل رہے ہیں فکر ہے نہ پریشانی۔

”میں بچہ نہیں ہوں.....“ وہ تند اور خونخوار نظروں سے واسقہ کو دیکھنے لگی۔

”تو کرو جو جی میں آئے“ کہتے ہوئے واسقہ آگے بڑھ گیا۔

”کیوں واسقہ اتنے غصے میں کیوں ہو“ کشت یار نے پوچھا۔

تو

واسقہ نے پلٹ کر صاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”ایک یہ مصیبت ہمارے ساتھ چل پڑی تھی.....“

”تم اس سے لڑ کر آئے ہو“

”ہونہہ.....“

”غلط بات واسقہ..... تم بزرگ آدمی کی ہدایت کیوں بھول جاتے ہو“

واسقہ شرمندہ ہو گیا۔ کشت یار پلٹ کر صاف کے پاس آیا اور ملامت سے بولا ”صاف ہم نے مل جل کر یہ کٹھن سفر طے کرنا ہے۔

واستقا اپنی سخت گوئی پر شرمندہ.....“

”میں بھی پتہ نہیں کیوں ایک دم غصے میں آجاتی ہوں“ صنف بولی۔

”اسی غصے پر قابو پانے کے لیے تو بزرگ نے ہدایت دی تھی۔ یہ بھی تو اک بڑی برائی ہے۔ بالکل گناہ ہے اور ہم لوگ گناہوں سے تائب ہونے اور اس کے بوجھوں سے نجات پانے ہی کے لیے تو یہ دشوار سفر طے کر رہے ہیں وہ نادم ہی ہو کر چپ ہو گئی۔

کشت یارا سے سمجھاتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

وہ تھوڑی دور ہی گئے تھے۔

کہ

رمیلہ اچھلتی کودتی ان کی طرف آئی اور خوشی سے چلائی ہم کسی بستی کے قریب پہنچ گئے ہیں اور اب شب ب سری کی کوئی فکر نہیں ”سچ“ صنف نے کہا۔

”ہاں۔ ہم نے وہاں چند مکان دیکھے ہیں“ اس نے جدھر سے آئی تھی ادھر منہ کر کے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

”یہاں سے تو نظر نہیں آ رہے“ صنف نے آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا سا بنا کر دیکھا۔

”تھوڑا آگے جاؤ گے نا تو سب نظر آئے گا“ رمیلہ نے کہا اور پھر کسی مست ہرنی کی طرح قلائچیں بھرتی اپنے ساتھ بچوں سے جا

ملی۔

بستی کچھ زیادہ بڑی نہ تھی۔ چند گھروں پر مشتمل تھی۔ کچھ گھر تو بڑے بوسیدہ تھے۔ کسی کی دیواریں گری ہوئی تھیں۔ کسی کی چھت

بیٹھ چکی تھی۔ کچھ گھروں کے آگے کوڑے کے ڈھیر لگے تھے۔ اور کچھ گھروں کی پیشانیوں کے پلستر اکھڑے ہوئے تھے۔

ساری بستی میں یہی ایک گھر تھا۔ جو بہت خوبصورت ڈھلانی رنگ دار چھتوں اور سفید پھولدار دیواروں والا تھا۔ صاف ستھرا چمن

تھا۔ جس میں رنگارنگ پھول لہرا رہے تھے۔ سبزہ قالمین کی طرح بچھا تھا۔

سب نے اسی گھر کے دروازے پر دستک دینا چاہی۔

لیکن

جب دستک دینے کو گھیرنے ہاتھ بڑھایا۔ تو اندر سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ جو دم بدم بڑھتی گئیں۔
گیر و ڈر کر پیچھے ہٹا۔

اس کے ساتھی بھی مسلسل چاؤں چاؤں کی آوازیں سن کر صدر دروازے سے پیچھے ہٹ آئے۔
”لگتا ہے ایک دو نہیں کئی کتے ہیں.....“ کشت یار نے آوازوں پر دھیان دیتے ہوئے کہا۔
”دروازہ بند ہے۔ ہو سکتا ہے گھر کا مالک کہیں ادھر ادھر ہو“ واسقہ بولا“ اسے تلاش کرنا چاہیے“
”باہر کیسے ہو سکتا ہے اندر ہی ہوگا“ فریدوں بولا۔

گیر و کچھ سوچتے ہوئے بولا“ ایک دفعہ دستک دینی تو چاہے۔ اب واسقہ یا کشت یہ کام کریں.....“

”ہاں ہاں۔ ہو سکتا ہے کتے بندھے ہوں اور مالک ہمیں پناہ دے دے“ صنف بولی تو تم ہی دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ سچی بات مجھے تو کتوں سے بہت ڈر لگتا ہے“ واسقہ پرے ہٹ گیا۔

”میں کوشش کرتا ہوں فریدوں نے ہمت اور عزم سے کہا اور آگے بڑھنے لگا۔“

لیکن دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے ہی کسی نے پکارا

”اے میرے بچے کیا کر رہے ہوں نہیں رہے اندر کتنے بھونک رہے ہیں“ سب نے پلٹ کر دیکھا۔

ایک بد وضع سی بڑھیا بے ترتیب سا لباس پہنے کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی جھرجھری سی آگئی۔ بڑھیا کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور باہر کو ابلی ہوئی لگتی تھیں۔ ہونٹ کالے اور موٹے تھے۔ ناک بدزیب تھی۔ چہرے کی رنگت پیلی تھی اور اس کے دانت انتہائی میلے کھیلے تھے۔

چونکہ اس نے دروازہ کھٹکھٹانے سے ان لوگوں کو منع کیا تھا۔ پھر بھی خوفزدہ ہونے کے باوجود وہ بڑھیا کے قریب آگئے۔

”اماں۔ تم نے ہمیں دروازہ کھٹکھٹائے کیوں نہیں دیا۔ ہم پر دیسی ہیں۔ اور رات یہاں گزارنی ہے“

”تو بہ تو بہ.....“ بڑھیا نے کانوں کا ہاتھ لگائے“ اچھا ہوا جو میں آگئی ورنہ دروازہ کھلتا تو یہ خوفناک کتے لحوں میں تمہیں چیر

پھاڑ کر رکھ دیتے۔“

سیہہ اور ر میلہ تو ڈر کر شام سے لپٹ گئیں۔

بڑھیا سب کو کتوں سے خوفزدہ کرتی رہی۔ واسقہ تو لرز رہا تھا۔ اسے کتوں سے واقعی بہت ڈر لگتا تھا۔

کتے اب بھی بھونک رہے تھے۔

”ان کے اتنے لمبے دانت ہیں“ بڑھیا نے ہاتھ سے اندازہ بتایا ”اور سنو یہاں بھیڑیے بھی ہیں“
”اف“ واسقہ نے آنکھیں بند کر لیں۔

”اور مالکن انہیں ہمیشہ بھوکا رکھتی ہے۔ ان کی خوراک تم جیسے پردیسی لوگ ہی ہوتے ہو.....“
”ہائے ہائے“ صصف نے سینے پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

فریدوں اور گیر بھی ڈرنے لگے۔ ایک کشت یار تھا۔ جسے بڑھیا کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیونکہ کتوں کی آوازوں سے لگتا تھا کہ یہ بڑے کتے نہیں پلے ہیں اسی لیے اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا ”بی بی تم جنہیں خونخوار کتے کہہ رہی ہو وہ آوازوں سے تو کتوں کے بچے لگتے ہیں..... بھیڑیوں والی بات بھی صحیح نہیں لگتی.....“

”لو اور سنو..... میں نے خود دیکھے ہیں۔ ان کی آوازیں ہی ایسی ہیں۔ بچو بھول کر بھی اس گھر میں قیام نہ کرنا۔ کیوں جانیں گنوائی ہیں۔ چلو میرے ساتھ میرے گھر میں رات گزار لو.....“

”یہ ٹھیک ہے“ واسقہ جلدی سے بولا۔

لیکن

اور

کسی نے بھی اس بڑھیا کے ساتھ جانے کی حامی نہ بھری۔ اس سے تو انہیں گھن آ رہی تھی۔ ریڑھ کی ہڈیوں میں جھنجھٹا ہٹ ہو رہی تھی۔ خوف کی کچپی طاری ہو رہی تھی۔ پھر بھلا وہ کیونکہ اس کے ساتھ جاتے۔ اور رات اس کے ہاں گزارتے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ یہیں کہیں درختوں تلے پڑ کر نیند نکال لیتے۔

اس نے سب سے کہا۔ بہت اصرار کہا۔ بڑھیا نے بھی بہت کہا۔ کتوں سے ڈرا یا گھر والوں سے خوف دلا یا اور تو اور یہ بھی کہا کہ خاتون خانہ نے بھیڑیے بھی رکھے ہوئے ہیں

لیکن

بچے تو ایک دوسرے سے چمٹ کر کھڑے ہوئے گئے۔ کشت یار بالکل نہیں مانا اور صصف بھی تذبذب میں رہی۔

”کشت یار“ ہال آخرو واسقہ غصے سے بولا ”تم ہمیشہ اپنی مرضی سب پر ٹھونستے ہو کیا ہرج ہے جو رات اس بی بی کے ہاں گزار

لیں۔“

”اوں ہوں“ کشت یار نے کہا۔

”نہیں تو نہ سہی۔ میں تو جا رہا ہوں۔ تم لوگ ڈالو اپنی جانوں کو خطرے میں مرنے کی سوجھ رہی ہے تو مرو.....“

واستف غصے سے چلاتا بڑھیا کے ساتھ چل دیا۔

وہ سب وہیں کھڑے ایک دوسرے کا منہ تکٹنے لگے۔

”اب کیا کریں“ کشت یار چند لمحے چپ رہنے کے بعد بولا۔

”تم ہمارے معتبر ساتھی ہو۔ جیسے کہو گے ہم کریں گے“ سب نے جواب دیا۔

”اچھا کچھ سوچتے ہیں.....“ وہ بولا۔

وہ ابھی کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ ایک نو عمر خوبصورت لڑکا باغیچے سے گھر کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ اس نے صاف ستھرا لباس پہن

رکھا تھا اور بڑا ہی چاک و چوبند دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا جسم گٹھا ہوا اور تونمند تھا۔

”اے بھئی“ گیر و نے اسے پکارا تو وہ رک گیا۔ اتنے لوگوں کو وہاں دیکھ کر وہ ادھر ہی آ گیا۔

”آپ نے مجھے پکارا.....“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

”جی ہاں“ گیر و نے کہا۔

”کہئے کیا کام ہے“ وہ بولا۔

”ہم مسافر ہیں۔ مسرتوں کے شہر جا رہے ہیں۔ رات سر پر آگئی۔ سوچا اس گھر میں بسر کر لیں۔ لیکن ان خوفناک کتوں کی وجہ

سے دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمت نہیں ہو رہی“

”خوفناک؟“ لڑکے نے کہا اور پھر ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بولا ”یہ تو بہت چھوٹے چھوٹے کتے ہیں.....“

”لیکن.....“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ میں اندر جا رہا ہوں۔ آپ میرے ساتھ آ کر کوددیکھ لیجئے۔“ وہ بولا۔

”سنا ہے اس گھر کی مالکن بھی.....“ کشت یار نے بات ادھوری چھوڑ دی تو لڑکا بولا ”میرا نام بہادری ہے اور اس گھر کی مالکن

خالہ دوستی ہے۔ آپ ان سے مل کر تو دیکھیں پتہ نہیں آپ کو کس نے بدظن کر دیا.....“

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بہادری نے قدم بڑھایا۔ اور دروازے پر دستک دی۔

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا اور ایک بے انتہا حسین نازک اندام اور بہترین لباس میں ملبوس خاتون نے دروازہ کھولا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر بڑی دلاویز مسکراہٹ تھی۔ اس کی آنکھوں میں شفیق چمک تھی۔ اس کی آواز بڑی رسیلی اور دلنفریب تھی۔ بہادری نے اسے مختصر ان لوگوں کے متعلق بتایا تو وہ بولی ”اوہو۔ تمہارا ایک ساتھی اس بڑھیا کے ساتھ چلا گیا۔ اس کا نام خوف ہے اور لوگوں کو ڈرانا اور خوفزدہ کر کے بزدل بنانا اس کا کام ہے۔ اس کا گھر گندہ اور بدبودار ہے۔ تمہارے ساتھی نے وہاں جا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ خیر آؤ تم سب تمہاری میزبانی پر مجھے فخر ہوگا.....“

سب کو واسقہ کے جانے کا افسوس ہوا۔

رات بھر وہ اس غریب کو ڈرا ڈرا کر اس کا خون خشک کرتی رہے گی ”دوستی سب کے اندر آ جانے پر بولی ”بیچارہ آدمی۔ آپ نے اچھا کیا جو اس کی باتوں میں نہ آئے“ ”ہمیں تو بہادری نے بچا لیا۔ ورنہ رات بھر ہم جانے کہاں کہاں خوار ہوتے“ کشت یار بولا۔ بہادری مسکرایا اور بولا ”میں کچھ دیر پہلے آجاتا تو آپ کے ساتھی کو کبھی وہاں جانے نہ دیتا۔“ اچھا بھئی ”دوستی بولی ”اب یہ ہمارے معزز مہمان ہیں۔ انہیں کمرے میں لے جا کر بٹھانا چاہیے۔ بہت تھکے ہوئے ہیں“

”ہاں دوستی“ صحت مسکرائی ”بلاشبہ ہم بہت تھکے ہوئے ہیں.....“

دوستی انہیں ایک عمدہ آراستہ پیراستہ کمرے میں لے آئی۔ جہاں بڑی آرام دہ گدے دار کرسیاں اور صوفے پڑے تھے۔ ایک طرف دو دیوان بھی بچھے تھے۔ آرائشی چیزیں بھی تھیں اور گلدانوں میں موسمی پھول بھی سجے تھے۔

سب نے چیزوں کی نفاست اور صفائی کو دیکھ کر اپنے گرد آلود کپڑوں کو دیکھا۔ وہ سب ان چمکتی دکتی گدیلے دار کرسیوں پر بیٹھنے سے ہچکچا رہے تھے۔

دوستی نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور بڑے خلوص اور پیار سے بولی ”کوئی بات نہیں آپ سب بیٹھے میں سب بندوبست کر لوں گی۔ وہ سب جھجکتے ہوئے بیٹھ گئے۔ لیکن دوستی کا رویہ اپنائیت لئے ہوئے تھا۔ اتنا خلوص تھا باتوں میں کہ سب کی جھجک خود ہی دور ہو گئی۔

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد وہ اٹھ گئی۔

جب واپس آئی تو اس کی خادما میں جنہوں نے خوبصورت لباس پہن رکھے تھے بلوریں گلاس مشروبات سے بھرے لے کر آ گئیں۔ سب کو بڑی تمیز سے انہوں نے مشروب پیش کئے۔

بچے تو دوستی خالہ پر جیسے فدا ہو رہے تھے۔ بڑے بھی تعریفیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد دوستی اندر آئی۔ اور بولی ”میں نے پانی گرم کروایا ہے۔ آپ لوگ غسل کر لیں.....“

”لیکن ہمارے لباس؟ یہی گندے اور میلے کچیلے کپڑے ہیں.....“

”آپ فکر نہ کریں۔ ان خاتون اور تینوں بچیوں کے لیے میں نے اپنے لباس نکال دیئے ہیں۔ دونوں لڑکوں اور آپ کے لیے میں نے بہادری کو بھیجا ہے۔ گوجگہ دور ہے لیکن بہادری کسی سے خوف نہیں کھاتا۔ وہ آپ کے لباس لے کر آتا ہی ہوگا۔“

”بہت بہت شکریہ محترمہ دوستی صاحبہ.....“ کشت یار دوستی کی عنایات سے مرعوب ہو کر بولا.....“

”شکریے کی کوئی بات نہیں آپ لوگ میرے دوست ہیں اور میرا یہ فرض ہے کہ جہاں تک ہو سکے آپ لوگوں کی مدد کروں۔ ہاں بچیوں نے ایک تھیلے میں کچھ فیتے پھول اور کنگھیاں بھی ڈال دی ہیں جاؤ تو ساتھ لے جانا۔ راستے میں بال وغیرہ بنانے کے کام آئیں گے“ دوستی خالہ آپ کتنی اچھی ہیں“ شاتم بولی۔

دوستی نے اسے پیار کیا اور بولی ”بیٹا یہ میرا فرض ہے تم لوگ نہا دھولو۔ تب تک کھانا لگ جائے گا۔ اور بستر بھی بنا دیئے جائیں گے.....“

اس نے اپنی نوکرائیوں کو بلا کر کہا کہ مہمانوں کو حماموں میں لے جائیں بہادری جلد ہی مردانہ کپڑے لے آیا۔ اسے ایک دور جگہ جا کر کپڑے لانا تھے۔ راستہ بڑا خوفناک تھا۔ لیک وہ صحیح سلامت واپس آ گیا تھا۔

نہا دھو کر اور عمدہ لباس پہن کر سب بے حد خوش ہوئے۔ روح میں تازگی اترتی محسوس ہوئی۔ سب دوستی کے احسان مند تھے۔ صحت و استقامت اور کشت یار تو دل ہی دل میں ندامت محسوس کر رہے تھے۔ اتنے مالدار اور صاحب حیثیت ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی کسی کی مدد نہ کی تھی۔

کھانا گو بہت پر تکلف نہیں تھا۔ لیکن جس محبت اور خلوص سے پیش کیا گیا۔ سب ہی دوستی کے اخلاق کے معترف ہوئے۔ رات گئے تک دوستی ان سب سے باتیں کرتی رہی اس نے بتایا کہ وہ انسانوں حیوانوں سب سے محبت کرتی ہے کہ یہ اللہ کی مخلوق

”میں نے گائے، بھینسیں، بکریاں، بھیڑیں، بلیاں، کتے سب پال رکھے ہیں یہ کتے جو بھونک رہے تھے۔ میرے مکان کے پچھواڑے میں رکھے ہوئے ہیں۔ آج کچھ موسم ان کی طبع کے مطابق نہیں تھا۔ اس لیے اندر کے صحن میں باندھ دیئے تھے۔ ہوتے تو کبھی نہ بھونکتے۔ آپ کو ان کی وجہ سے خواہ مخواہ زحمت ہوئی۔“

”اوہ دوستی خالہ“ سیبہ اس کے گلے میں بازو جمائل کر کے بولی ”آپ کتنی اچھی اور عظیم ہیں“

شاتم نے بھی کہا ”دوستی خالہ آپ نے تو ہمیں اپنے گرویدہ بنا لیا ہے۔ میرا تو جی نہیں چاہے گا کہ آپ کو چھوڑ کر جاؤں“

”واقعی شاتم میرا بھی جی یہی چاہتا ہے کہ دوستی خالہ کے پاس ہی رہ جاؤں.....“ لیکن ہمیں جانا ضروری ہے“ فریدوں بولا۔

دوستی مسکرائی اور بولی ”ہاں میں جانتی ہوں۔ آپ سب کی پشتوں پر بار لدے ہیں۔ انہیں اتارنا ضروری ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو میں آپ لوگوں کو کئی دن اپنے ہاں ٹھہراتی.....“

”شکریہ..... شکریہ.....“ سب کہہ اٹھے۔

”اچھا.....“ دوستی بولی۔ ”رات بہت ہو چکی ہے۔ ہم نے باتیں بھی خوب کر لی ہیں۔ اب آپ لوگ جا کر سو جائیں۔ صبح آپ کو پھر سفر پر نکلنا ہے۔“

”ہاں نیند تو نہیں آ رہی۔ لیکن لیٹنا چاہیے“ گہرو بولا۔ ”ہم آپ کے شکر گزار ہیں..... بہت سکون ملا آپ کے ہاں آ کر.....“

دوستی سب کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔ جہاں صاف ستھرے بستر پانگلوں پر لگے تھے۔ یہاں بھی تکیے نرم اور آرام دہ تھے۔ سوتے وقت ان کے کب ان تکیوں کی وجہ سے تکلیف سے بچ سکتے تھے۔

سب نے پھر دوستی کا شکریہ ادا کیا۔

اور

۵۵

سب کو شب بخیر کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

واستفہ کی بری حالت تھی۔ بڑھیا اسے اپنے بدبودار گھر میں لے آئی تھی۔ اور ایک سیلن زدہ کمرے میں جس کی دیواروں کی قلعی

اکھڑی ہوئی تھی۔ چھت سے جالے لنگ رہے تھے۔ اور فرش جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔ واسقہ کو بٹھایا۔ واسقہ کو مجبوراً اس گندے کمرے میں بیٹھنا پڑا۔

خونفک بڑھیا پیلے پیلے دانت نکال کر مسکراتے ہوئے بولی ”میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔ شکر کرو تم میرے ساتھ آگئے اور تمہیں کھانا نصیب ہوگا۔ تمہارے ساتھی تو ان خونفک کتوں کے پیٹ کی خوراک بن رہے ہوں گے“

بڑھیا کچھ ہی دیر بعد ایک ٹرے لے آئی۔ اس پر اک بے حد میلا خون پوش پڑا تھا واسقہ کے سامنے ٹرے رکھ کر اس نے خون پوش ہٹایا۔

”لو کھاؤ“

واسقہ کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ بڑھیا کی طرح کھانا بھی کراہت آمیز تھا۔ ایک بے قلعی کٹورے میں چھپکلیاں تھیں۔ جنہیں اہال کر نمک مرچ ڈالی ہوئی تھی۔ ایک ٹوٹی پھوٹی پلیٹ میں گول گول لال کیڑے تھے۔ جو نمکین پانی میں تیر رہے تھے۔ ایک میلے سے دسترخوان میں سوکھی روٹی کے چند ٹکڑے تھے۔

واسقہ پر خوف کی کپکپی طاری تھی۔

”کھاؤ نا.....“ بڑھیا بڑے بھدے انداز میں دانت نکالتے ہوئے بولی۔

”نہیں بی.....“ وہ ہکلا یا..... ”مجھے اس وقت بھوک نہیں ہے“

وہ ہنسی اور بولی ”ساری رات گزارنا ہے تمہیں کچھ تو کھا لو۔“

واسقہ نے لرزتا ہوا ہاتھ بڑھایا اور سوکھی روٹی کا ٹکڑا نکال لیا۔

”بس“

”یہی کافی ہے“

”کچھ اور لے آؤں“

”نہیں مجھے کچھ زیادہ بھوک نہیں بلکہ بالکل ہی بھوک نہیں۔ مجھے اپنے ساتھیوں کا غم کھائے جا رہا ہے..... افسوس.....“

”افسوس کہ وہ کتوں کی خوراک بن رہے ہیں۔ سوچو ذرا۔ کتوں نے انہیں کیسے چیز پھاڑ ڈالا ہوگا۔ انتڑیاں پیٹوں سے باہر ہوں

گی۔ کسی کا بازو کتا چبا رہا ہوگا، کسی کی ٹانگ۔ آنکھیں تو ابلی پڑی ہوں گی۔ اور تمہیں پتہ ہے۔۔۔۔؟“

”کیا.....؟“ واسقہ زرد پڑتے ہوئے بولا۔

”وہاں اور بلائیں بھی ہیں۔ تم صبح وہاں جاؤ گے تو دیکھو گے کہ تمہارے سب ساتھیوں کا کس طرح صفایا ہو چکا ہے۔ نہ وہاں خون ہوگا نہ ہڈی اور نہ ہی بوٹی۔ بلائیں لمبی لمبی زبانوں سے سب کچھ چاٹ گئی ہوں گی.....“

”تم خوش نصیب ہو۔ جو میرے ساتھ چلے آئے اور ان بد بختوں کا ساتھ نہ دیا۔“ بڑھیا واسقہ کے حواس پر خوف و ہراس طاری کرتی رہی۔ ایسی ایسی وحشت ناک باتیں کہیں کہ واسقہ کے ہوش جواب دینے لگے۔

بڑھیا نے باتوں کے دوران پوچھا ”تم لوگ ادھر کیسے آ گئے؟“

واسقہ نے جلدی سے اپنی رام کہانی سنائی۔ تو وہ خوفناک قہقہہ لگاتے ہوئے بولی ”ہائے ہائے۔ اتنے سے کب کی خاطر تم لوگوں نے اپنی جانیں خطرے میں ڈالیں۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ دنیا میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس کب کے ساتھ کیا تم زندگی نہیں گزار سکتے.....“

واسقہ کچھ نہیں بولا۔

بڑھیا بولی ”میری ماں تو سفر ترک کر کے میرے پاس ہی رہ جاؤ۔ آگے تو تمہیں جن مصیبتوں اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ ابھی تو تم نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ مسرتوں کا شہر ابھی دور ہے۔ اور اس کا دشوار ترین راستہ تو آگے آئے گا.....“

واسقہ کے ہاتھ سے سوکھی روٹی کا ٹکڑہ گر گیا۔ اس پر کپکپی طاری تھی۔

”تم سونا چاہتے ہو۔ تولیٹ جاؤ.....“ بڑھیا نے کافی دیر ڈرانے کے بعد کہا۔ واسقہ نے نگلی زمین کو دیکھا۔ تو وہ بولی ”میں بستر لا دیتی ہوں.....“

کچھ ہی دیر بعد وہ ایک بوسیدہ کمبل لے آئی۔ کمبل سے اتنی بو آ رہی تھی کہ واسقہ نے ناک پر ہاتھ رکھ لیا.....

بڑھیا نے ایک طرف کمبل بچھا دیا۔

دیئے کی روشنی میں واسقہ نے دیکھا کہ کمبل پر جوئیں اور چیونٹیاں ریگ رہی تھیں۔ وہ سر تا پا لرز گیا۔

”لیٹ جاؤ“ بڑھیا بولی۔

”آپ جا کر آرام کریں۔ میں بھی لیٹ جاؤں گا“ بڑی مشکل سے واسقہ نے کہا۔ اور پتہ نہیں کیسے بڑھیا اس کی بات مان گئی۔ وہ کمرے سے نکلی تو واسقہ نے اٹھ کر کمبل کو پیروں سے گول کیا۔ اور دروازے سے باہر پھینک دیا۔

اس نے دروازہ بھی اندر سے بند کر لیا۔ تاکہ بڑھیا پھر اندر نہ آسکے۔

ساری رات وہ بھوکا پیاسا کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ کبھی زمین پر بیٹھ جاتا۔ افسوس بھی ہوتا کہ وہ خواہ مخواہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر اس عذاب خانے میں آ گیا ہے۔ پھر خیال آتا کہ اس کے ساتھی کتوں کی خوراک بن گئے ہوں گے۔ چلو یہاں آ کر جان تو بچ گئی۔ ایک عذاب کی رات ہی ہے گزر جائے گی۔

بڑھیا رات کو پھر اندر تو نہ آئی۔

لیکن

واسقہ کو مہیب آوازوں اور ڈراؤنی چیخوں سے رات بھر ڈراتی رہی۔ واسقہ کو تو کسی کسی وقت یوں لگتا کہ بڑھیا سے خوفزدہ کر کے جان ہی سے مار ڈالے گی خدا حافظ کر کے دن نکلا۔

ٹوٹے پٹوں سے روشنی اندر آئی

تو

واسقہ نے خدا کا شکر ادا کیا۔ دروازے کی درزوں سے باہر جھانکا۔ تو گندہ مندرہ صحن خالی نظر آیا۔

اس نے ہولے سے دروازہ کھولا۔ گردن باہر نکالی ادھر ادھر دیکھا

اور

جب

اطمینان ہو گیا کہ صحن میں کوئی نہیں ہے۔ تو دبے پاؤں باہر نکلا۔

بڑھیا غالباً ابھی سو رہی تھی۔

واسقہ نے ایک ہی جست لگائی اور دروازہ پار کر کے باہر آ گیا۔ اس کے قدم آپوں آپ اس گھر کی سمت اٹھنے لگے۔ جس میں اس کے خیال کے مطابق اس کے ساتھیوں کے لاشے تک بلائیں اچک لے گئی ہوں گی۔

دل ہی دل میں ان کے لیے دکھ محسوس کرتا وہ اس گھر کی طرف جا رہا تھا۔ جو صبح کی نورانی روشنی میں چمک رہا تھا۔ اور جس کے باغیچے میں خوبصورت اور رنگارنگ پھول مہک رہے تھے۔ اور جس کی سرسبز گھاس پر قدم رکھتے ہوئے لگتا تھا۔ دبیز قالین پر چل رہے

ہوں۔

بدول بدحواس اور رات بھر کی بے چینی اور خوف و ہراس سے ادھ مواء واستقا اس گھر کے قریب پہنچا۔ تو اندر سے اسے ہنسنے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔

وہ

چونکا

کیونکہ ہنسنے والوں میں کشت یار اور بچوں کی آوازیں نمایاں تھیں
ایک لمحہ کوشش درسا رہ گیا۔

پھر

خوشی کی لہر اس کی رگ رگ میں دوڑ گئی۔

تو کیا کشت یار زندہ تھا؟

اور بچے؟

وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ صدر دروازہ کھلا تھا۔ اس نے دروازے میں قدم رکھا تو اسے برآمدے میں شاتم اور سیبہ نظر آئیں۔ جنہوں نے بے انتہا خوبصورت لباس پہن رکھے تھے۔ جن کے بال رنگین فیتوں سے بندھے تھے۔ اور جو بہت ہی ہشاش بشاش نظر آرہی تھیں۔“

”یہ کیا؟“ وہ بے تابانہ سے بے اختیارانہ آگے بڑھا۔ تو اس نے کشت یار اور صحن کو دیکھا جو ایک حسین عورت کے ساتھ سفید گدے دار کرسیوں پر بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے۔ رمیلہ اس حسین عورت کی کرسی کے ہتھے پر بیٹھی تھی اور اپنا بازو اس کی خوبصورت گردن میں جمائل کر رکھا تھا۔

فریدوں اور گیر و کو بھی اس نے قریب ہی کھڑے دیکھا۔ حیرانی کی بات تو تھی ہی واستقا کے لیے کہ وہ سب لوگ زندہ سلامت تھے۔ لیکن وہ ششدر تھا کہ سب صاف ستھرے اور خوبصورت لباسوں میں ملبوس تھے۔ خوشدلی سے گپ شپ لگا رہے تھے۔ انکے چہروں پر ایسی بشاشت تھی۔ جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

وہ ابھی کھڑا سب کو دیکھ ہی رہا تھا کہ فریدوں کی نظر اس پر پڑی۔ پہلے تو اس نے سرنفی میں ہلایا۔

”نہیں یہ واستقا نہیں.....“

پھر

اس نے گیر کو اس کی طرف متوجہ کیا

”اوہ۔ یہ تو واسقہ ہے۔ رات بھر میں اس کا کیا حال ہو گیا.....“

دونوں اس کی طرف لپکے

شاتم اور سیہہ نے بھی اسے دیکھا اور چیخنے کے انداز میں بولیں ”ہائے واسقہ نہیں کیا ہو گیا“

کچھ ہی دیر بعد سب واسقہ کو گھیرے کھڑے تھے۔ واسقہ اس بڑھیا کی چالاکی اور خوفناکی کے قصے بیان کرتے ہوئے اب بھی

لرز رہا تھا

گیر و سرہلاتے ہوئے بولا ”واسقہ جب ہم نے کشت یار کو اپنا بڑا مان لیا ہوا ہے تو پھر تمہیں اس کی بات مان لینا چاہیے تھی۔“

صحف طنز سے بولی ”بات مان لیتا۔ تو یہ حال نہ ہوتا نا؟ ذرا اپنا حلیہ تو دیکھو واسقہ“

واسقہ نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

تو

کشت یار نے سب کو اشارے سے منع کیا کہ واسقہ کو اور شرمندہ نہ کریں۔

دوستی سب کو دیکھ رہی تھی۔ سب چپ ہوئے تو وہ اپنے نرم اور مشفق لہجے میں بولی ”واسقہ تم نے یقیناً سبق سیکھ لیا ہو گا کہ اتفاق

اچھی چیز ہے۔ کاش تم رات اس خوف کے ہتھے نہ چڑھتے“

”میں شرمندہ ہوں۔ رات میں نے جتنی تکلیف اور اذیت سے کاٹی یہ کشت یار کا کہنا نہ ماننے کی سزا تھی.....“

”چلو کوئی بات نہیں۔ آؤ میرے ساتھ..... نہادھو کر کپڑے بدل لو..... بہادری نے شادی تمہیں دیکھ لیا تھا۔ اس لیے وہ

تمہارے لیے بھی کپڑے لے آیا تھا۔ آؤ نہادھو کر کھانا کھانا اور پھر کچھ دیر آرام کرنا.....“

”ہاں خاتون“ کشت یار بولا۔ ”یہ بہت خوفزدہ اور بوکھلا یا ہوا ہے۔ آپ کی شفقت اور مہربانی کی اسے ضرورت ہے“

وہ مسکرا کر بولی ”جو اسے بھی ضرور ملے گی“

”شکریہ“

دوستی واسقہ کو ساتھ لے کر اندر چلی گئی

اور

یہ

سب دوستی کے خلوص اور محبت کے گن گانے لگے۔

سفر پھر شروع تھا۔

سب تازہ دم اور ہلکے پھلکے ہو رہے تھے۔ دوستی کے خلوص اور محبت نے انہیں جیسے نیا عزم اور حوصلہ عطا کر دیا تھا۔

یوں وہ

ہنستے مسکراتے

باتیں کرتے

بڑھے چلے جا رہے تھے۔

”کشت یار“ واسقہ نے چلتے چلتے کہا

”ہوں“

”تم نے راہبر سے مسرتوں کے شہر کا پتہ پوچھا تو تھا۔ تو اس نے کیا کہا تھا“

”تم بھی تو وہیں تھے.....“

کشت یار خوشدلی سے مسکراتے ہوئے بولا ”دھیان سے بات سننے کی عادت ڈالو“ ”اب تو ضرور ڈالوں گا“

”ویسے کشت یار“ فریدوں قریب آتے ہوئے بولا۔

”کیا“

”ہم لوگوں کی کتنی عادتیں بدلتی جا رہی ہیں.....“

”میں بھی ایسا ہی محسوس کرتا ہوں“ گیرو بولا ”دوستی خالہ نے تو اتنا متاثر مرعوب کیا ہے کہ جی چاہتا ہے میں بھی ان سا ہو

جاؤں.....“

”واقعی“ شاتم اٹھلا کر بولی۔

رمیلہ نے کہا ”میں تو دل و جان سے ان پر فدا ہوں۔ بالکل ان جیسی بننے کی کوشش کروں گی۔“
ہمارے مزاج اور سوچیں واقعی بدلتے جا رہے ہیں کشت یار بولا۔ ”میں تو اپنے اندر بڑی تبدیلی پار رہا ہوں۔“

”وہ بزرگ ہمارے گناہوں کے بوجھ ہماری پشتوں پر یوں ظاہر نہ کرتا۔ تو ہم شاید گناہوں کی دلدل میں دھنستے ہی چلے جاتے“
گیر بولا۔

”ہم خوش قسمت ہیں جو ایسا ہوا“ فریدوں بولا۔

صاف منہ بناتے ہوئے بولی ”لیکن جو اتنی مصیبتیں بھگت رہے ہیں.....“
”کبھی تم ختم ہوں گی“ سیدہ بولی۔

”جب مسرتوں کے شہر میں پہنچ جائیں گے تب نا“ صاف بیزاری نظر آئی۔

واسقہ نے موضوع بدلنے کو پھر کشت یار سے کہا ”بھئی بزرگ نے تمہیں راستوں کے متعلق بتایا تھا نا.....“
”ہاں“

”تو اب ہم کہاں ہیں.....“

”فریب کے جنگل کے قریب“

”فریب کے جنگل؟ کیا مطلب؟ یہ کون سا جنگل ہے؟“

”پتہ نہیں“ کشت یار لا پرواہی سے بولا۔ ”میں نے تفصیل نہیں پوچھی تھی۔ بس بزرگ نے یہی بتایا تھا۔ اور تم کو یہ معلوم ہے نا
اس نے کہا تھا سیدھے راستے چلتے جانا“

”ہاں“

”تو پھر اس سیدھے راستے ہی میں یہ جنگل بھی پڑتا ہوگا“

”ہوں“

”ہاں بزرگ نے یہ کہا تھا کہ یہ جنگل جتنی جلدی ہو سکے عبور کر لینا۔ شام سے پہلے ہمیں یہ جنگل عبور کرنا ہے۔“

”تو پھر تیز تیز قدم اٹھانا چاہئیں۔“

”ہاں.....“

”وہ سامنے درخت تو نظر آرہے ہیں.....“

”یہی جنگل ہوگا.....“

اب وہ تیز قدم اٹھا رہے تھے۔ جگہ جگہ جھاڑ جھنکار تھی اس کے بعد درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو گھٹنا ہوتا چلا گیا۔ بعض جگہ تو درخت اتنے گھنے تھے کہ بمشکل ایک آدمی گزر سکتا تھا۔

”غالبا یہی وہ جنگل ہے“ کشت یار ایک خاردار جھاڑی سے اپنے نئے کپڑے بچاتے ہوئے بولا۔

”کافی گھٹنا ہے“ سیبہ بولی۔

”جنگل تو گھنے ہی ہوتے ہیں بیوقوف“ فریدوں نے ہنس کر کہا۔

”بیوقوف ہو گئے تم“ سیبہ چہک کر بولی۔

”ہائے سیبہ۔ تم نے بیوقوفوں والی بات ہی تو کی تھی۔ فریدوں نے بیوقوف کہہ دیا تو کیا ہو گیا.....“ رمیلہ فوراً بولی۔

”بھائی ہی کی طرف داری کرو گی تم دونوں“ سیبہ کو غصہ آئے جارہا تھا۔

”تم خواہ مخواہ الجھ رہی ہو“ شاتم نے کہا۔

سیبہ کچھ جواب دینے والی تھی کہ پیچھے سے گیرو نے بہن کو پکارا ”سیبہ تم میرے پاس آ جاؤ۔ جانے دو ان بیوقوفوں کو پاگل کہیں گے“

”پاگل ہو گئے تم“ شاتم نے تلخی سے کہا۔

سیبہ ان تینوں بہن بھائیوں کو چھوڑ کر پیچھے اپنے بھائی کے پاس آ گئی۔ کشت یار واسقہ صحت اور وہ تینوں بہن بھائی آگے پیچھے درختوں کی شاخیں ہٹاتے راستہ بناتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں احساس بھی نہ ہوا کہ سیبہ اور گیرو پیچھے رہ گئے ہیں۔ گیرو نے سیبہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ”انہیں جانے دو.....“

”کیوں؟“ سیبہ رکتے ہوئے بولی۔

گیرو نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر خود مڑا اور اسے بھی اپنے ساتھ واپس لے جانے لگا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ سیبہ حیرت سے بولی۔

”شش۔ خاموش رہو“ گیرو نے پھر چپ رہنے کا اشارہ کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گھیننے کے انداز میں اسے ساتھ لے جانے لگا۔

وہ حیرت زدہ سی اس کے ساتھ ساتھ واپس گھسٹی گئی۔

جب سب کافی دور نکل گئے اور ان کی آوازیں سنائی دینا بند ہو گئیں تو گیر و تیز تیز قدم اٹھا تا سیبہ کو لیے ایک درخت کے قریب آیا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہیں تھی.....“

”کیا؟“ سیبہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔

”یہیں تھی۔ میں نے خود دیکھی تھی.....“ گیر و ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتے ہوئے بولا ”میں نے خود دیکھی تھی“

”کیا؟“ کس کی بات کر رہے ہو“ گیر و کے دیکھا تھا یہاں سیبہ بولی

”چپ“ گیر و بولا اور پھر ایک دم چلایا ”وہ رہی..... وہ.....“

سیبہ نے دیکھا گیر و ایک چمڑے کی تھیلی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ جو پتھروں کے درمیان پڑی تھی۔

”یہ کیا ہے گیر و.....“ وہ لپک کر اس کے پاس آئی۔ جو جھک کر تھیلی اٹھا رہا تھا گیر و نے تھیلی اٹھالی اور ایک پتھر پر بیٹھ کر اسے کھولتے ہوئے سیبہ سے بولا۔ ”جب ہم یہاں سے گزر رہے تھے تو اس تھیلی پر میری نظر پڑی تھی۔ میری کوشش تھی کہ تمہیں کسی طرح واپس بلا لوں۔ تاکہ ہم دونوں آ کر یہ تھیلی اٹھالیں۔ خود ہی موقع بن گیا اور میں نے تمہیں واپس بلا لیا.....“

”اس میں ہے کیا؟“ سیبہ تجسس سے بولی۔

”یقیناً اشرفیاں ہوں گی.....“ گیر و تھیلی کے حکمے کھول رہا تھا۔

”ہائے جلدی کھولو“ وہ بے تابی سے بولی۔

گیر و کے ہاتھ تجسس سے کانپ رہے تھے۔ تھیلی کافی وزنی تھی۔ بالآخر اس نے تھیلی کا منہ کھولا اور فرط مسرت سے چلایا ”سیبہ

مہریں ہیں اس میں سونے کی.....“

سیبہ بھی شوق کی فراوانی سے چلائی ”واقعی“

”ہاں یہ دیکھو.....“ گیر و نے تھیلی کا کھلا منہ بہن کے سامنے کر دیا..... ”اف سونے کے سکے.....“

”ہاں“

”تھیلی بھری ہوئی ہے“

”اتنی دولت؟“

”یہ اب ہماری ہے ہم دونوں کی.....“

”اتنے پیسے تو شاید کشت یا ربھی اپنی تھیلیوں میں بھر کر نہیں لایا.....“

”پتہ نہیں“ گیر و تھیلی بند کرتے ہوئے بولا۔ ”میں اس تھیلی کو اپنے لباس کے اندر چھپا کر کمر سے باندھ لیتا ہوں۔ تم کسی سے اس

کا ذکر نہ کرنا.....“

”تھوڑی سی ہو۔ زیادہ نہیں“ گیر و کی مارے خوشی کے باچھیں کھلی جا رہی تھیں ”میں ناراض ہو جاؤں گی“ سپہ لاڈ سے بولی۔

”نہ نہ میری بہن.....“ گیر و تھیلی اپنے لباس کے اندر کمر کے گرد نپکا باندھ کر اس میں باندھتے ہوئے بولا۔

”اتنے بوجھ کو لے کر چل سکو گے“

”دولت بوجھ نہیں ہوتی میری بہن“

”بالکل ٹھیک کہتے ہو.....“

”چلو اب“

”چلو“

دونوں نے واپسی کے لیے قدم اٹھائے۔ اور اپنی دانست میں اس طرف چل دیئے۔ جہاں سب جا رہے تھے۔

لیکن

کافی دیر چلتے رہنے کے بعد بھی انہیں اپنے ساتھی دکھائی دیئے نہ ہی ان کی آوازیں سنائی دیں۔

”گیر و“

”ہاں“

”یہ ہم کہاں جا رہے ہیں.....“

”جدھر وہ سب گئے تھے.....“

”نہیں..... میرا خیال ہے ہم بھٹک گئے ہیں.....“

”اس گھنے جنگل میں صحیح راستہ بھی تو نہیں ملتا۔“

”اب کیا ہوگا.....“

گھبراؤ نہیں.....“

”کیسے نہیں گھبراؤں..... اتنا گھنا جنگل ہے اور ہم ساتھیوں سے بچھڑ گئے ہیں۔ سیہہ رو دینے کو تھی۔

گیر و اسے تسلی دلا سے دیتے ہوئے خود بھی پریشان ہو رہا تھا۔

ایک درخت کے قریب رک کر گیر و نے چاروں طرف نظر دوڑائی..... سب طرف ایک ہی طرح کے گھنے درخت اور جھاڑ

جھنکا رہی۔ راستے کا تعین کرنا مشکل تھا۔ وہ بڑبڑایا۔

”گئے تو سب اسی طرف تھے“

”نہیں۔ ہم راستہ بھول گئے ہیں گیر و“ سیہہ بھائی سے چٹ گئی۔ دیکھ نہیں رہے ہم جتنا آگے جا رہے ہیں۔ جنگل اتنا ہی گھنیرا

ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں تو کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہیں.....“

”ہوں“

”اب کیا کریں گے ہم“

”تم اتنا گھبراؤ گی۔ تو میں کچھ بھی نہ سوچ پاؤں گا۔“

”ہائے گیر و۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے“

”میرے کندھے کے ساتھ لگ جاؤ“

سیہہ اس سے چٹ گئی۔ گیر و ایک سمت اندازے ہی سے قدم اٹھانے لگا۔ پشت پر کب کا بوجھ کمر میں سکوں کی تھیلی کا وزن۔

اوپر سے سیہہ نے بھی اپنا سارا بار اس پر ڈال رکھا تھا۔ اس لیے گیر و بڑی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

”کون ہو تم“

اس آواز کے سنتے ہی گیر و اور سیہہ جو ایک درخت کے تنے سے لگے بیٹھے ہاتھوں پر سر گرائے پریشان حال تھے۔ سر اٹھا کر

دیکھا۔

سیہہ کی آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔ اور جو اس نے ہاتھ منہ پر دھر نہ لیا ہوتا۔ تو ایک لمبی چیخ فضا میں گونج جاتی۔

گیر و بھی پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگا جس نے کہا تھا ”کون ہو تم؟“

آواز تو کسی بڑے آدمی کی لگی تھی۔

لیکن

جو

سامنے کھڑا تھا۔ اس کا قد دو فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ اس کا سر بڑا چہرہ چوڑا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں ہونٹ لٹکے ہوئے تھے اور موچھیں گھنی اور بڑی بڑی تھیں۔ اس کے بازو پتلے پتلے اور ٹانگیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔

اس نے دوبارہ پوچھا۔

”کون ہو تم۔ اور یہاں کیسے آئے؟“

جواب دینے کی بجائے گہرو نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ہمت کر کے پوچھا ”تم کون ہو؟“

”میں؟“

”ہاں“

”میں یہاں کے بونے سردار کو نوکر ہوں“

”بونے سردار!.....“

”ہاں“

”کیا وہ بھی تمہارے جیسے قد کا ٹھہکا ہے“

”ہاں۔ یہ ساری بستی بونو کی ہے“

”اچھا“

گہرو نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اسے بستی کے کچھ مکان نظر آئے۔ مکان نئے بھی تھے پرانے بھی۔ کچھ بہت خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔ کچھ بھدے سے۔ ان مکانوں میں ایک الگ تھلگ تھا۔ جو سب سے بڑا اونچا اور خوبصورت تھا۔ گہرو کو اندازہ کرتے دیر نہ لگی کہ یہ مکان بستی کے سردار کا ہے۔

”تم لوگ یہاں اس طرح کیوں بیٹھے ہو“ بونے نے پوچھا۔

”ہم راستہ بھول گئے ہیں.....“

”فریب کے جنگل میں ایسا ہوتا ہی ہے..... تم یقیناً اکیلے ہو گے“

”نہیں تو ہمارے اور ساتھی بھی ہیں۔ ہم ان سے بچھڑ گئے“

”تم جا کہاں رہے تھے“

”مسرتوں کے شہر“

”اچھا“

”کیا تم ہمیں سیدھا راستہ بتا سکتے ہو۔ جو مسرتوں کے شہر جاتا ہو“

”بونا مسکرایا اور بولا ”پہلے تم میرے ساتھ چلو.....“

”کہاں“

”میرے سردار کے پاس.....“

گیرو نے سیہ کی طرف دیکھا جو اب پہلے کی طرح خوفزدہ نہ تھی۔ اس نے گیرو سے کہا ”چلو چلتے ہیں۔ بونوں کی بستی بھی دیکھ

لیتے ہیں۔ اور سردار کا گھر بھی.....“

گیرو نے بونے سے کہا ”چلو ہم تمہارے سردار کے ہاں چلتے ہیں.....“

”آؤ“

”چلو“

دونوں بہن بھائی بونے کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ راستے میں سیہ نے سرگوشی کے انداز میں گیرو سے کہا ”یہ بونا ہمیں کسی مصیبت

میں نہ پھنسا دے.....“

گیرو تمسخر سے ہنسا ”اب ہم ایسے گئے گزرے بھی نہیں۔ جو ان چھوٹے چھوٹے بونوں سے بھی نہ نپٹ سکیں.....“

”وہ پیسوں کی تھیلی کہاں ہے“

”فکر نہ کرو۔ اسے میں نے اپنے لباس کے اندر چھپا رکھا ہے.....“

”بس ٹھیک ہے“

وہ بونے کے ساتھ چلتے گئے۔ بونا انہیں سردار کے گھر کے سامنے لے آیا = گیرو اور سیہ حران ہوئے کہ سردار کا مکان چھوٹا سا

نہیں تھا۔ بلکہ عام مکانوں سے بھی اونچا اور بڑا تھا۔

بونے نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

”کون“ اندر سے بھاری مردانہ آواز آئی۔ سیہ گیر و کا کندھا پکڑ کر اس کے ساتھ لگ گئی۔

”کھولو دروازہ“ بونے نے کہا۔

دروازہ کھل گیا۔ چوڑے اور اونچے دروازے میں ایک بونا ہی کھڑا تھا۔

سیہ گیر و سے الگ ہو کر کھڑی ہوئی۔

”انہیں سردار کے پاس لے جاؤ“

”اچھا“

گیر و اور سیہ نے دروازے کے اندر قدم رکھا۔ ان کے ساتھ آنے والا بونا باہر ہی سے واپس ہولیا۔ اندر والا بونا انہیں راہداری

سے لے جاتا ایک ہال نما کمرے میں لے آیا۔ اس کمرے کے دروازے پر دو بونے پہریداروں کا لباس پہنے کھڑے تھے۔

گیر و اور سیہ اندر داخل ہوئے۔

انہوں نے دیکھا۔ ہال سجا ہوا تھا۔ کرسیاں بچھی تھیں۔ قالین پرے تھے اور کھڑکیوں پر پردے لہرا رہے تھے۔ ہال میں کچھ

چیزیں بے ترتیب تھیں اور جگہ جگہ پھلوں کے چھلکے اور کاغذوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔

سامنے ہی ایک مسند پر تکیوں کے سہارے ایک بونا بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر سنہری پگڑی تھی۔ اور لباس بھی ریشمی تھا۔

دونوں سمجھ گئے کہ یہی سردار ہے۔

آؤ..... آؤ..... سردار نے انہیں اپنی طرف بلایا۔ اب دونوں کا ڈراتر گیا تھا۔ اس لیے وہ بے خوف بونے کی طرف بڑھے۔

اور مسند کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔

سردار انہیں دیکھ کر خوشی سے چلایا ”بہت خوب۔ آج ہمارے نوکر نے بہت اچھا کام کیا.....“

”جی“ گیر و اس کی بات سے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

”ہمیں تم جیسے نوکروں کی ہی ضرورت تھی.....“

”نوکر“ سیہ چلائی

”ہاں“ سردار ہنسا

”لیکن ہم نوکر تو نہیں“ گیر و گھبرا کر بولا۔

”ہمارے ہاں جو کوئی بھی آ جاتا ہے ہم اسے اپنا نوکر بنا لیتے ہیں“

”لیکن.....“

”لیکن ویکن کچھ نہیں“ سردار گرجا..... تم ہمارے نوکر ہو“

”نہیں.....“ سیبہ بولی ”ہم مسرتوں کے شہر جا رہے تھے۔ راستہ بھول گئے۔ ہمیں مسرتوں کے شہر کا پتہ بتا دو.....“

سردار کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بولا۔ ”اس بات کا اندازہ تو میں نے تمہارے ان نکلے ہوئے کیوں ہی سے لگا لیا ہے۔ لیکن تم اب

یہاں سے کہیں نہیں جا سکتے۔ کم از کم چھ ماہ تک تم دونوں کو میرے ہاں نوکر رہنا ہوگا“

”سردار.....“ گیر و بولا۔

لیکن سردار نے اس کی بات سنے بغیر کہا ”تم جیسے میرے پاس بہت سے لوگ ہیں لیکن وہ سب کام چور ہیں۔ ٹھیک طرح کام

نہیں کرتے۔ روز ڈنڈوں سے مار کھاتے ہیں۔ ٹھیک ٹھیک کام کرنا..... سمجھے“

”لیکن.....“ سیبہ رو ہانسی ہو گئی.....“

گیر و نے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا جو کھلا ہوا تھا یقیناً وہ یہاں سے بھاگ لینے کی سوچ رہا تھا۔

سردار اس کے تیور بھانپ گیا اس لیے قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”فرار ہونے کی مت سوچو.....“

گیر و نے گھبرا کر سردار کی طرف دیکھا۔ چھوٹے سے قد والے سردار نے بڑا سا سر ہلاتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

اب تو دونوں بہن بھائی گھبرا گئے۔

”اچھا یہ بتاؤ“ سردار مونچھوں کو تالا دیتے ہوئے بولا۔

”کیا؟“

”تمہیں جھاڑو دینا آتا ہے“

”نہیں.....“ گیر و اور سیبہ نے بیک وقت کہا۔

انہوں نے نہیں کہا ہی تھا کہ دروازہ اک کھٹاک سے بند ہو گیا۔ دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔ اور پھر حیرانگی سے سردار کی طرف

دیکھنے لگے۔

سردار کھلکھلا کر ہنس دیا۔

پھر

بولتا ”جھاڑو دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ یہ ہر کوئی دے سکتا ہے۔ تم دونوں سے جھوٹ بولا۔ اسی لیے یہ دروازہ بند ہو گیا.....“

”ہاں.....“ اس گھر میں جب کوئی جھوٹ بولتا ہے تو یہ دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے۔ اور جب کوئی سچ بولتا ہے تو دروازہ کھل

جاتا ہے.....“

گیر اور سیبہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں عجب محمے میں پھنس گئے تھے۔

”تم نے جھوٹ بولا تھا نا.....“ سردار نے کہا۔

دونوں چپ رہے۔

سردار ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ گیر اور سیبہ سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ انہیں سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کیا کریں۔

سردار چند لمحے چپ ہوا۔

پھر

ایک دم بولا ”ایک صورت میں میں تمہیں یہاں سے جانے دے سکتا ہوں“

”وہ کیا ہے“ دونوں بولے۔

”اگر تم مجھے ڈھیر سارے پیسے دے دو تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا“

گیر اور سیبہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

سردار پھر بولا ”کیا تمہارے پاس ڈھیر سارے پیسے ہیں؟“

”ہاں“ ایک دم ہی سیبہ نے کہا۔ گیر وانکار کرنے ہی کو تھا۔ لیکن سیبہ نے پہلے ہی بول اٹھی۔

اور

اس کے ساتھ ہی اس نے دیکھا کہ دروازہ خود بخود کھل گیا ہے۔

سیبہ چلائی ”گیرو بھاگو دروازہ کھل گیا ہے.....“

دونوں پلٹے اور چیزیں پھیلا گتے چند لمحوں ہی میں دروازے سے نکل گئے۔
 ہونا نہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔

دونوں سرپٹ بھاگے جا رہے تھے۔ ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے۔ اور منہ اٹھائے دوڑے جا رہے تھے۔
 وہ کافی دور نکل گئے۔

اب انہیں ہونوں کی بستی نظر نہ آ رہی تھی۔
 دونوں ہانپ رہے تھے۔

”رکو گیرو..... اب ہم یقیناً ہونوں کی پہنچ سے دور نکل آئے ہیں۔“ ایک پیڑ کے ساتھ ٹھیک لگا کر پھولے سانسوں سے سیہہ
 بولی۔

”ہاں.....“ گیرو بھی رک گیا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔
 چند لمحوں کے بعد دونوں لمبے لمبے بے ربط سانس لیتے رہے۔ جب سانسوں کا توازن کچھ بحال ہوا۔ تو سیہہ بولی۔
 ”گیرو..... آج ہمارے سچ نے ہمیں بچا لیا۔ میں سچ نہ بولتی تو وہ دروازہ کبھی نہ کھلتا“
 ”واقعی“ گیرو بولا

”پتہ نہیں وہ ہونا ہمارا کیا حشر کرتا“..... سیہہ بولی۔
 ”ہاں“ گیرو کو سر جھک گیا..... ”میں تو جھوٹ بولنے ہی کو تھا کہ تم سچ کہہ اٹھیں“
 ”تو بہ..... جھوٹ بولتے تو جان بچانا بھی مشکل ہوتی“

”بے شک“

”گیرو“

”ہاں“

آؤ عہد کریں کہ آئندہ کبھی جھوٹ نہ بولیں گے۔ ہمیشہ سچ بولیں گے۔“ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو گیرو نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ
 رکھ کر عمر بھر سچ بولنے کا عہد کیا۔

اب دونوں خوش بھی تھے اور مطمئن بھی

دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

اور

ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ انہیں رمیلہ اور فریدوں کی آوازیں سنائی دیں آوازوں کی طرف لپکے۔

”فریدوں“

”رمیلہ“

انہوں نے آوازیں دیں۔ تو دونوں بہن بھائی ان کی طرف دوڑتے ہوئے آئے۔

”تم دونوں کہاں رہ گئے تھے۔ ہم سب تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے.....“

فریدوں اور رمیلہ انہیں سب ساتھیوں کے پاس لے آئے۔

”تم لوگو کہاں چلے گئے تھے“ کشت یار نے غصے سے کہا۔ تو گیر و کا سر جھک گیا سیبہ بھی شرمندہ سی نظر آنے لگی۔

”بتاتے کیوں نہیں“ صغف نے سیبہ کا کندھا ہلا کر پوچھا ”کہاں تھے تم لوگ“ ”ہم بمشکل جانیں بچا کر آئے ہیں“ گیر و نے

کہا۔

”کیوں؟“ کشت یار نے پوچھا۔

تو

گیر و اور سیبہ نے ساری بات سچ سچ بتادی۔ وہ دونوں اپنی بد نمیتی پر شرمندہ بھی تھے۔

”ہوں“ کشت یار بولا۔ ”کہاں ہے وہ پیسوں کی تھیلی“

گیر و نے تھیلی کا منہ کھولا..... اور ہاتھ مار کر سکے دیکھنے لگا۔ چند لمحوں بعد اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

”نقلی پیسے“ وہ تمسخر سے ہنس کر بولا ”تمہیں نقلی اصلی کی بھی تمیز نہیں بے وقوفو“ ”کیا“ گیر و نے گھبرا کر کہا۔

صغف نے بھی پیسے دیکھے وہ سب نقلی سکے تھے۔

”یہ دیکھو“ کشت یار نے پیسے تھیلی پر رکھ کر گیر و اور سیبہ کو دکھائے۔ وہ واقعی نقلی اور کھوٹے سکے تھے

دونوں بہت شرمندہ ہوئے۔

سب ان کو شرمندہ دیکھ کر ہنسنے لگے۔

”بس بس“ واستق نے ہاتھ اونچا کر کے سب کو ہنسنے سے منع کرتے ہوئے کہا ”ان دونوں کو اپنے کئے کی سزا مل گئی ہے۔ دونوں شرمندہ بھی ہیں۔ اس لیے اب نہیں معاف کر دو“

”ہاں“ کشت یار نے تھیلی پرے زمین پر پھینکتے ہوئے کہا۔ پھر گیسو سے مخاطب ہو کر بولا ”تم بھول گئے تھے تاکہ یہ فریب کا جنگل ہے“

”چلو“ صغف بولی ”اس سے انہوں نے سبق تو سیکھا۔ سچ بولنے کا عہد کر لیا“

”اچھی بات ہے۔ ہم سب کو یہ عہد کرنا چاہیے“

سب تھوڑی دیر وہیں کھڑے باتیں کرتے رہے.....

اب

وہ

سب

تیز تیز قدموں سے چلتے جا رہے تھے۔ راستہ کبھی انتہائی تنگ اور دشوار گزار ہو جاتا..... یہاں چونکہ ایک ایک آدمی کو گزرنا پڑتا اس لیے حفاظت کے لیے وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتے تاکہ کوئی ساتھی ادھر ادھر ہو کر بچھڑ نہ جائے..... جہاں راستہ نسبتاً کشادہ ہوتا۔ وہاں دو تین ٹولیوں کی صورت میں گزرتے۔

خوش باش

گپ شپ لگاتے۔

اور

کھی کھی

کوئی خوبصورت نظم گاتے۔

”بھئی جلدی قدم اٹھاؤ“ کشت یار نے ایک تنگ رستے سے گزرنے کے بعد کہا۔

”ہاں شام اترنے والی ہیں۔“ فریدوں بولا۔

اور بابا نے ہمیں کہا تھا کہ شام اترنے سے پہلے یہ جنگل پار کر لینا۔“ کشت یار بولا۔

”یہ فریب کا جنگل ہے۔“ واسقہ بولا۔

”ہاں واقعی“ گہرو نے شرمساری سے کہا“ میں تو فریب کھا گیا تھا۔

”شکر ہے بچ کے آگئے“ شاتم بولی۔

”ورنہ چھ مہینے گئے تھے“ سیہ نے کہا۔

”سچ میں بڑی طاقت ہے اس نے تمہیں بچا لیا۔ مان گئے بھی۔ سچ میں بڑی طاقت ہے“ کشت یار نے سنجیدگی سے سر ہلاتے

ہوئے کہا۔

واسقہ نے کچھ کہنے کی بجائے صفحہ کو دیکھا۔ جو سب سے پیچھے تھی..... اس کے چہرے پر تکان کے ساتھ خستگی کے بھی آثار

تھے۔ لگتا تھا اب وہ مزید تکلیفیں برداشت نہیں کر سکے گی۔

”صفحہ“ واسقہ نے اسے آواز دی

”کیا ہے“ وہ جھلا کر بولی

”جلدی جلدی قدم اٹھاؤ۔ تم تو بچوں سے بھی گئی گزری ہو“

”جیسی بھی ہوں تمہیں کیا“

”مجھے تو کچھ نہیں۔ ڈر صرف یہی ہے کہ فریب کے جنگل میں ادھر ادھر ہو گئیں۔ تو جان سے جاؤ گی.....“

وہ بیزار سے بولی ”جان سے جیسے اب نہیں جا رہی.....“

”اوہو صفحہ“ کشت یار پلٹ کر بولا ”یوں حوصلہ ہارو گی تو مسرتوں کے شہر کیونکر پہنچو گی“

صفحہ نے منہ بنایا۔ اور بڑبڑائی ”میں نے تو ناحق ہی یہ سفر شروع کیا۔ موہین اچھی رہی جو راستے ہی سے پلٹ گئی۔“

”ہائے ہائے“ شاتم اس کی بات سن کر بولی ”یہ کوئی اچھی بات کی موہین نے۔ ساری عمر یہ بد نما کب لیے پھرنے سے اچھا نہیں

کہ چند دن کی یہ تکلیف کاٹ لی جائے.....“

”لو سنو“ واسقہ نے تحسین بھری نظروں سے شاتم کو دیکھتے ہوئے صفحہ سے کہا

لیکن

اس نے شاتم کو داد دی

اور

نہ ہی واسقہ کی بات کا جواب دیا۔

بس منہ بنائے بیزار بیزار قدم اٹھاتی گئی۔

شام اتر رہی تھی..... پرندے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ رہے تھے۔ درختوں میں بے گھونسوں میں ہلچل مچ رہی تھی۔

”رات کی فکر ہے کچھ“ صف نے ایک جگہ رکتے ہوئے کہا۔ ”اب تو ہم جنگل کے آخری سرے پر آ ہی گئے ہیں.....“

یہاں سے نکل کر ہی کوئی ٹھکانہ تلاش کریں گے“

”خدا کرے کوئی بستی قریب ہو“

”ضرور ہوگی“

اب جنگل واقعی ختم ہو رہا تھا۔ درخت چھدرے چھدرے تھے کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے گھاس کے میدان تھے..... آبادی

کے آثار بھی نظر آنے لگے تھے۔

بچوں نے خوش ہو کر نعرے لگائے

”ہم نے قریب کا جنگل پار کر لیا“

”اب کوئی خطرہ نہیں.....“

”ہم مسرتوں کے شہر پہنچ کر دم لیں گے“

بچوں کی باتوں کے جواب میں صف ایک درخت تلے پڑے بڑے سے پتھر پر بیٹھے ہوئے بولی

”میں تو یہاں دم لوں گی.....“

”اوہو“ شاتم اس کا کندھا پکڑ کر بولی ”بستی تک تو چلو نا.....“

”میں نہیں جا سکتی“

”کھانا نہیں کھانا“

”اور سونا بھی کیا اس پتھر پر ہے“

صحنے نے لے لے لے سانس چھوڑتے ہوئے بولی ”تم لوگ جا کر رات گزارنے کا ٹھکانہ بناؤ اور کھانا بھی دیکھو کہاں سے مل سکتا ہے۔ میں یہیں بیٹھتی ہوں.....“

کشت یار چند لمحے کچھ سوچتا رہا..... پھر بولا ”ٹھیک ہے..... تم ان لڑکیوں کے ساتھ یہیں ٹھہرو..... ہم چاروں جاتے ہیں.....“

”میں بھی ساتھ چلتی ہوں“ سیبہ نے کہا ”بستی دیکھوں گی.....“

”نہیں سیبہ“ شاتم بولی ”ہم یہیں رک جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو جانے دو۔“

”تم بھی صحنے کی طرح تھک گئی ہو۔ سیبہ نے طنز کیا تو

شاتم ہنس کر بولی۔ ”اے بہن۔ تھکی تو رمیلہ بھی نہیں جو مجھ سے بھی چھوٹی ہے۔ میں تو ویسے ہی صحنے کا ساتھ دینے کو کہہ رہی

ہوں۔ سیبہ نے منہ بنایا اور ہولے سے بولی۔ ”صحنے کو بچوں سے کیا لگاؤ.....“

”اب ہے“ شاتم نے بھی ہولے سے کہا۔

”ہونٹھ“ سیبہ نے کندھے اچکائے

پھر

وہ دونوں رمیلہ کو ساتھ لے کر صحنے کے پاس آ گئیں

اور

کشت یار واسقہ فریدوں اور گیرو کے ساتھ بستی کی طرف نکل گیا۔

یہ ایک ویران سی بستی تھی۔ چند مزدوروں کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے تھے۔ ایک سرائے تھی۔ جس کے باہر ایک پرانا ساتنور

تھا۔ روٹی اور دال یہاں سے مل سکتی تھی۔

سب نے یہ ہی غنیمت جانا۔

کشت یار نے سرائے والے کو بستر لگانے کے لیے کہا۔ اور تنور والے کو روٹیوں اور دال کا آرڈر دیا۔

فریدوں اور گیرو صحنے اور لڑکیوں کو بلانے چلے آئے۔

روکھی سوکھی کھا کر سب بوسیدہ سی سرائے کے ہال نما کمرے میں لگائے گئے بستروں میں گھس گئے، بستر بھی نامکمل سے تھے۔ کسی

کو گد املا کسی کو درمی..... کس کو تکیہ کسی کو چادر پھر بھی

سب تھکے ہوئے تھے

لبی تان کر سو گئے۔

صبح جب بیدار ہوئے تو سورج کی نورانی کرنیں کھڑکیوں کے ٹوٹے ہوئے پنوں سے آری ترچھی ہو کر اندر پڑ رہی تھیں۔ باہر لوگوں کے بولنے چالنے کی آوازیں آرہی تھیں اور تنور پر شاید تانبائی گھی والے پرائٹھے لگا رہا تھا۔ ہال میں پرائٹھوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔

باری باری سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ سرائے کے مالک نے پچھلے غسل خانہ نما کمرے میں پانی بھرا کر رکھ دیا تھا..... بستروں سے نکل کر سب باہر آ گئے۔ کچھ کھیتوں میں چلے گئے۔ کچھ درختوں کے جھنڈوں میں..... واپس آ کر سب نے ہاتھ منہ دھوئے..... ٹھنڈا اور ستھرا پانی موجود تھا..... سب نے اچھی طرح اپنے آپ کو تازہ دم کیا۔ دو دن کے بعد آج لڑکیوں نے اپنے بالوں کے فیتے کھولے..... اور دوستی خالہ کی دی ہوئی کنگھیوں سے بال بنائے بالوں میں نئے فیتے باندھے اور صاف نے جوڑا بنا کر مصنوعی پھولوں کا گچھا ان میں اڑس لیا۔ مردوں نے بھی کنگھیوں سے بال درست کئے اور دوستی خالہ کو یاد کر کے اس کی تعریفیں کرتے رہے

اب وہ واپس ہال میں آئے

تو

سرائے کے ملک نے بستر اٹھا کر وہاں لکڑی کی میزیں اور کرسیاں لگوا دی تھیں جو ہر چند کہ پرانی تھیں۔ لیکن بیٹھنے کے قابل ضرور تھیں۔

میز پر تھالیوں میں روغنی پرائٹھے اور پیالیوں میں دہی رکھا تھا..... کچھ کٹوریوں میں اچار بھی تھا..... اور چینی کے پھولدار پیالے دودھ سے بھرے رکھے تھے۔ دودھ میں اصلی شہد کی آمیزش تھی۔

سرائے کے مالک نے سب کو خوش آمدید کہا اور پھر بولا ”اس وقت جو کچھ حاضر ہے کھا لیجئے..... دراصل یہ ایک ویران بستی ہے۔ کچھ لوگ ہی رہتے ہیں۔ یہاں..... اس لیے کھانے پینے کی اچھی چیزیں یہاں نہیں ملتیں۔“

”اس سے اچھی چیزیں اور کیا ہوں گی.....“ کشت یار کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”واقعی“ واستقد دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

”یہ ہمارے لیے کسی نعمت سے کم نہیں.....“ فریدوں بولا۔

”مسرتوں کے شہر جا رہے ہیں“ مالک نے پوچھا۔

”ہاں.....“ گیسرو نے کہا ”لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا.....“

وہ مسکرایا اور بولا ”تمہارے پشتوں پر لدے بوجھ دیکھ کر.....“

”کیا تم نے پہلے بھی ہماری طرح کے کبوں والے لوگ دیکھے ہیں؟“ شاتم نے جلدی سے سوال کیا

”ہاں“ مالک نے جواب دیا..... ”کئی بار..... ایسے لوگ اکثر میری سرائے میں آ کر ٹھہرتے ہیں.....“

”تو..... تو کیا۔ مسرتوں کے شہر پہنچ کر ان کے کب واقعی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔“

فریدوں نے بے تابانہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں..... بالکل ٹھیک ہو جاتے ہیں“ مالک نے جواب دیا ”میں ایسے کئی لوگوں سے مل چکا ہوں..... اچھا اب آپ کھانا

تو کھائیں۔ پراٹھے گرم گرم ہوں تو لطف دیتے ہیں“ سب کھانا کھانے لگے۔

پراٹھے اتنے خست اور مزیدار تھے کہ سب ہی نے چنچارے لے لے کر کھائے اچار سے تو پراٹھوں کا لطف دو بالا ہو گیا۔

مالک ہر ایک کے قریب باری باری آتا اور پیٹ بھر کر کھانے کے لیے کہتا ”آپ فکر نہ کریں..... ہم کھانے سے پورا پورا

انصاف کر رہے ہیں“ کشت یار نے ہنس کر کہا

”زندگی میں پہلی بار اتنا عمدہ اور اچھا ناشتہ کیا ہے“ واستقد رومال سے منہ صاف کرتے ہوئے بولا

”دراصل آپ لوگ کئی دنوں سے سفر کر رہے ہیں نا“ مالک ملائمت سے بولا ”اس لیے جو روکھی سوکھی مل جاتی ہے۔ وہ آپ لوگوں

کو بھلی لگتی ہے“

”نہیں.....“ واستقد بولا ”ناشتہ تھا ہی لذیذ.....“

”اور کچھ چاہیے“ جب سب نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیے تو مالک نے پوچھا

”نہیں۔ شکریہ“ تقریباً سب ہی نے کہا

”میرے خیال میں تو ہم نے اتنا پیٹ بھر کر کھالیا ہے کہ اب دوپہر کو کھانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی“ کشت یار بولا۔

کچھ دیر سب باتیں اور تعریفیں کرتے رہے۔

پھر

کشت یار اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ہی سب ساتھی بھی اٹھے۔

”اب ہمیں اجازت دیں۔ تاکہ ہم اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔“

”بے شک“ مالک بولا۔ ”ابھی کافی سفر باقی ہے۔ اس لیے میں آپ کو روک کر آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا.....“

”بہت بہت شکریہ“

سب ہال سے باہر نکل آئے

مالک انہیں کچھ دور تک چھوڑنے گیا۔

”اب آپ تشریف لے جائیے..... ہم سیدھے راستے پر آگئے ہیں خود ہی چلے جائیں گے؟ ہم آپ کے بے حد شکر گزار

ہیں.....“ کشت یار نے مالک کا سب کی طرف سے بھی بڑی انکساری سے شکر یہ ادا کیا۔

کشت یار جیسے مغرور اور رعونت پسند آدمی میں اتنی بڑی تبدیلی آگئی تھی کہ وہ اک معمولی آدمی سے اتنے عجز و ادب سے باتیں کر

رہا تھا۔ اس کی یہ تبدیلی خوش کن تھی۔ کٹھن سفر نے مزاجوں کو بڑی حد تک تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔

سب نے مالک کو سلام کیا۔

”ہم نے ان کا نام تو پوچھا ہی نہیں“ سیبہ نے قدم اٹھاتے ہوئے کہا

”اوہ ہوا واقعی۔ نام تو پوچھنا چاہیے“ کشت یار بولا۔ وہ دو قدم پیچھے مڑا اور مالک کے قریب آتے ہوئے بولا۔

”محترم..... ہم نے آپ کا نام تو پوچھا ہی نہیں..... ہم آپ کی محبت کو نہیں بھولیں گے۔ ہم کس نام سے آپ کو یاد

کریں.....“

مالک مسکراتے ہوئے بولا ”میرا نام مہربان ہے“

”شکریہ۔ کشت یار نے ایک بار پھر اس سے ہاتھ ملایا اور اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹ گیا۔ جو مالک کا نام جاننے کے مشتاق

تھے۔

”وہ مہربان تھا۔“ کشت یار نے سب سے کہا۔

”واقعی..... وہ مہربان تھا“ سب نے کہا۔

اور

پھر

ہی کی باتیں کرتے سب سیدھے راستے پر چلنے لگے۔

وہ

سب

چلتے جا رہے تھے

چلتے جا رہے تھے

باتیں بھی ہو رہی تھیں..... راستے میں جن جن اچھے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئی تھیں وہ ان کو بڑے اچھے الفاظ میں یاد کر رہے تھے۔

سفر کٹ رہا تھا

سب تازہ دم تھے۔

باتوں باتوں میں وقت گزرتے پتہ بھی نہ چلا اور نہ ہی یہ احساس ہوا کہ وہ کہاں پہنچ چکے ہیں

اچانک شاتم نے اپنے دائیں ہاتھ دیکھا..... تو حیرانگی سے دیکھتی رہ گئی.....

”یہ دیوار.....“ اس کے منہ سے نکلا

”ہاں..... یہ دیوار کب شروع ہوئی“ کشت یار بھی رک گیا

”پتہ ہی نہیں چلا“ فریدوں بھی دائیں ہاتھ اٹھی اونچی دیوار کو دیکھتے ہوئے بولا سب وہیں رک گئے

اور

مز مڑ کر دیکھنے لگے۔ تا حد نگاہ انہیں اونچی اٹھی ہوئی دیوار نظر آ رہی تھی۔

”باتوں باتوں میں پتہ ہی نہیں چلا کہ یہ دیوار کہاں سے شروع ہوئی“ واسقہ نے کہا

”اور آگے تو دیکھو۔“ سیبہ بولی ”دیوار کہیں ختم ہوتی بھی نظر آ رہی“

سب نے آگے کی جانب دیکھا..... دیوار کا کوئی سرا نظر نہیں آ رہا تھا۔

”خاصی اونچی اور مضبوط دیوار ہے“ صف نے کہا

”ہاں بہت اونچی..... پھلانگتے کا تو سوال ہی نہیں۔ کم از کم پندرہ بیس فٹ اونچی ہوگی۔

”بنی بھی پتھروں کی ہے“

”چوڑی بھی خاصی ہوگی“

”لیکن اس دیوار کا شروع اور آخر کہاں ہے۔“

”مجھے تو لگتا ہے۔ ہم گولائی میں گھوم رہے ہیں۔“

”اے نہیں راستہ سیدھا جا رہا ہے“

”تو پھر دیوار بھی سیدھی ہے کیونکہ راستے کے ساتھ ساتھ جا رہی ہے“

”ہاں“

”پھر اس کا سرا کہیں نہ کہیں ہونا تو چاہیے“

”بڑھتے چلو..... کہیں تو ختم ہوگی۔“

کشت یار کے کہنے پر سب نے قدم اٹھائے۔ صف اب بھی سب سے پیچھے تھی۔ ”پتہ نہیں مسرتوں کے شہر کے لیے ابھی کتنی کٹھن

مسافت طے کرنی ہے“ صف نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ابھی کافی دور جانا ہے۔ میرے خیال میں ابھی آدھا سفر کٹنا ہے۔“

”آدھا بھی نہیں۔“ گیرو بولا۔۔۔۔۔۔ ”ہم راستے میں کافی دیر رکتے آئے ہیں“

”چلو کٹ ہی جائے گا نا۔۔۔۔۔۔ ہمت ہارنے سے کام نہیں چلے گا۔۔۔۔۔۔“

وہ باتیں کر رہے تھے کہ فریدوں سامنے اشارہ کرتے ہوئے چلایا ”وہ رہا دیوار کا آخری سرا۔۔۔۔۔۔“

”کہاں“

”جہاں کچھ لوگ کھڑے ہیں۔۔۔۔۔۔“

”ہمیں بھی حصہ لینا پڑے گا۔“ گیسرو نے پوچھا

”بالکل“

”لیکن ہم لوگ یہ کام نہیں جانتے“

”پتھر تو اٹھا سکتے ہیں۔ چونے گارے کے تسلے تو اٹھا کر لاسکتے ہیں؟“

”لیکن-----“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ ایک تو یہ ہماری بستی کا قانون ہے۔ دوسرا کارثواب بھی ہے۔ آپ لوگ تو پہلے ہی گناہوں کے بوجھ گھنٹروں

کی صورت پشتوں پر لادے ہوئے ہیں۔ کیا ابھی تک آپ کے دل مومن نہیں ہوئے۔ اپنے گناہوں کا احساس نہیں ہوا۔؟“

”ہوا ہے اسی لیے تو اتنے کٹھن سفر کر رہے ہیں“

”پھر تو آپ کو اس کارخیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔ یہ ظلم کے خلاف اٹھائی جانے والی دیوار ہے-----“

وہ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے

پھر

فریدوں آگے بڑھا اور بولا۔ ”میں اور گیسرو اپنے سب ساتھیوں کا کام بھی کر دیں گے“

”نہیں بھی ہر ایک کو یہ کام کرنا ہے“ مجاہد بولا

گیسرو اور فریدوں نے کچھ دیر تک راکھی

فریدوں ”یہ کشت یار ہیں۔ ہمارے شہر کے بہت بڑے اور امیر ترین آدمی۔ اور یہ واسقہ ہیں۔ یہ بھی امیر آدمی ہیں۔-----“

اور-----“

وہ کچھ اور کہنے ہی کو تھا۔ مجاہد مسکرا کر بولا۔----- ”پھر تو ان کا ظلم کے ساتھ خاصہ رابطہ ہوگا۔-----“

کشت یار جلدی سے بولا ”میں دیوار چنوں گا“

”میں بھی۔-----“ واسقہ نے کہا۔

”اور صہف کو بھی بلا لو۔----- وہ کہاں ہے“

مجھے کیا پتہ۔----- آتی ہی ہوگی“

”ہم سب بچے بھی یہ کام کریں گے“

”چلو شروع ہو جاؤ۔۔۔۔۔ ہم ظلم کے خلاف دیوار اٹھانے میں ان لوگوں کی ضرورت مدد کریں گے۔۔۔۔۔“

سب کام میں جٹ گئے۔ کسی نے ہیلچہ پکڑا کسی نے تسلہ کوئی پتھر اٹھائے آگے بڑھا اور کسی نے تیبی کانڈی سنبھالی۔ مجاہدانہ نہیں شاباش دینے لگے۔ خوب شور مچا اور کام ہونے لگا۔

صحن جب قریب پہنچی اور اسے پتہ چلا کہ اس راستے سے گزرنے والے ہر مسافر کو یہ کام کرنا ہے۔

تو

اس نے ناک منہ چڑھایا۔ اتنی آرام طلب اور ست الوجود صحن تو پہلے ہی نالاں تھی۔۔۔۔۔ صرف چلنا ہی مشکل لگتا تھا۔۔۔۔۔ اس پر یہ محنت طلب اور گندہ مندہ کام۔

اس نے اپنے خوبصورت لباس پر نگاہ ڈالی اور پھر اپنے نازک ہاتھوں کو دیکھا۔

”اے“ پیچھے سے ایک سریلی سی آواز آئی۔

صحن نے پلٹ کر دیکھا۔ تو ایک نازک اندام خوبصورت لڑکی بڑے ہی نفیس لباس میں ملبوس اسے اشارے سے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ وہ درخت کی اوٹ میں اس طرح کھڑی تھی کہ دیوار پر کام کرنے والے لوگ اسے نہ دیکھ سکیں۔

صحن نے حیرانگی اور اشتیاق سے اسے دیکھا۔

”ادھر آ جاؤ۔۔۔۔۔“ لڑکی نے اسے اشارہ کیا۔۔۔۔۔ ”جلدی کرو۔۔۔۔۔“ وہ لوگ تمہیں ادھر آ تا دیکھ نہ لیں۔۔۔۔۔“

صحن نے جلدی سے قدم اٹھایا۔ اور تقریباً بھاگتے ہوئے اس لڑکی کے قریب آگئی۔ اب وہ دونوں درخت کے چوڑے تنے کے پیچھے تھیں۔ اور دیوار پر کام کرنے والوں کی نظر سے اوجھل تھیں۔

صحن نے بڑے شوق اور پیار سے اس لڑکی کو دیکھا جس نے اس کا من موہ لیا تھا

”کون ہو تم۔۔۔۔۔“ اس نے پیار سے پوچھا۔

”سستی“ وہ مسکرائی

”کیا؟“

”میرا نام سستی ہے“

صہف اس کا منہ تھکنے لگی

سستی نے اس کا ہاتھ تھاما۔۔۔۔۔ اور ایک طرف کولے جاتے ہوئے بولی ”وہ سامنے میرا گھر ہے تم تھکی ہوئی لگتی ہو۔ چلو میرے گھر چل کر آرام کرو۔۔۔۔۔ ان لوگوں نے تمہیں دیکھ لیا۔ تو تم سے بھی بیگار لیں گے۔ جلدی چلو۔۔۔۔۔“

صہف سستی کا ہاتھ پکڑ کر تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

”ہمارا گھر اس بستی سے الگ تھلگ ہے۔ میرے ساتھ میری بڑی بہن کاہلی بھی رہتی ہے۔ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہو گی۔۔۔۔۔“

صہف اس کے ساتھ گھر تک جا پہنچی

”ہم دونوں بستی والے مجاہدوں سے چھپ کر یہاں رہتے ہیں۔“ سستی بولی ”ہم سے محنت نہیں ہوتی۔ ہم تو سدا آرام کرنے کے عادی ہیں۔۔۔۔۔“

”میں بھی“ صہف کے منہ سے بیساختہ نکل گیا۔۔۔۔۔“

”پھر تو تمہیں ہمارے ساتے رہنے سے خوشی ہوگی۔۔۔۔۔“

سستی نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا۔۔۔۔۔ اور صہف کے اندر جانے کی جگہ بناتے ہوئے بولی ”یہاں تم مزے سے رہو گی۔ کوئی کام نہ کاج۔ بس آرام ہی آرام۔۔۔۔۔“

صہف کولے کر سستی ایک بڑے سے کمرے میں آگئی

”کاہلی“ سستی نے دروازے میں کھڑے ہو کر پکارا۔ تو ایک نرم گدے دار پٹنگ میں تکیوں میں دھنسی لڑکی نے بیدلی سے سراٹھا کر دیکھا۔

”کیوں سستی“

”دیکھو تو کون آیا ہے“

”کون ہے“

”مہمان۔۔۔۔۔ یہ خاتون ہمارے ہاں رہیں گی۔ بالکل ہماری طرح کی ہیں۔۔۔۔۔“

صحف بمشکل اپنی بے تاب خوشی چھپاتے ہوئے بولی ”کیوں نہیں۔ میں بھی تو ایسی ہی زندگی کی عادی تھی۔۔۔۔۔“

”اچھا“

”ہاں“

پھر تو طے ہو گیا“

”بالکل۔۔۔۔۔ مجھے آپ کے ساتھ ہمیشہ رہ کر خوشی ہوگی“ صحف بھی نرم نرم بستر میں دھنتے ہوئے بولی۔

سب لیٹے لیٹے باتیں کرنے لگیں۔۔۔۔۔ نوکرانیاں کھانے پینے کی چیزیں اور مشروبات لے آئیں۔ سب کے سامنے تھاں لے کر کھڑی ہو گئیں اور لقمے توڑ توڑ کر ان کے منہ میں ڈالنے لگیں۔

صحف کو تومزہ آ گیا۔ اتنا آرام اور ایسا سکون تو اسے گھر پہ بھی شاید میسر نہ تھا۔ وہ ان دونوں بہنوں سے گھل مل کر باتیں کرنے لگی۔

اور

اسے

احساس بھی نہ ہوا کہ ڈھیر سا رات گزر گیا ہے۔ اور اس کے ساتھی دیوار پر اپنا کام مکمل کر کے اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونکی

”کون“ کاہلی نے لیٹے لیٹے پوچھا۔۔۔۔۔ پھر سستی سے کہا کسی نوکر سے کہو دروازہ کھولے سستی نے وہیں سے ہانک

لگائی۔ نوکرانی نے دروازہ کھولا۔۔۔۔۔

اور

کچھ ہی دیر بعد کشت یار اور باقی ساتھی دروازے میں کھڑے تھے۔ کشت یار نے صحف کو یوں لیٹے دیکھ کر غصے سے کہا ”تم

یہاں لیٹی ہو۔۔۔۔۔ اور ہم تمہارے حصے کا کام بھی کر کے تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔۔۔۔۔“

”تمہارے حصے کی چنائی بھی ہم نے کی“ واستد غصے سے بھرا ہوا تھا۔“

صحف ان کی باتوں پر مسکرا کر تامل سے بولی ”اچھا کیا۔۔۔۔۔“

”اچھا کیا یا برا۔۔۔۔۔ اب اٹھو۔۔۔۔۔ ہم سفر پر نکلنے والے ہیں“ گیرو بھی غرایا۔

”ہونہ۔۔۔۔۔“ صف طنز سے ہنسی

”ٹھیک ہے“ کشت یار مڑا۔۔۔۔۔ ”ہم چلتے ہیں۔۔۔۔۔“

”شوق سے جاؤ“ وہ بولی۔۔۔۔۔ ”لیکن میری مانو۔۔۔۔۔ تو سفر ترک کر دو۔۔۔۔۔ اور سب یہیں رہ جاؤ ان

بہنوں کے پاس۔۔۔۔۔ مزے سے زندگی گزارو۔۔۔۔۔“

”بھد شوق“ کاہلی نے کہا۔

”جی نہیں“ واسقہ غرایا ”ہمیں ایسا کوئی شوق نہیں۔“

”تو جاؤ مرو۔۔۔۔۔ دھکے کھاؤ مصیبتیں اٹھاؤ اور رخ کرو مسرتوں کے شہر کا“ صف کے طنز پر سب کا پارہ چڑھ گیا۔

صف نے نہ آنا تھانہ آئی

اب وہ سب اس کے بغیر ہی سفر پر روانہ ہو رہے تھے۔ وہ دروازے سے نکلے تو پیچھے سے کاہلی کی آواز آئی۔ ”بیچارے“

صف نے قہقہہ لگایا۔

سب کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔۔۔۔۔ اب وہ صف کے بچھڑنے سے اداس نہیں تھے۔ بلکہ غصے میں بھرے

تھے۔

”کیوں؟ کیا اپنی منزل تک پہنچ گئی ہو۔۔۔۔۔ جو یوں آرام سے لیٹی ہو“ شاتم نے چمک کر کہا۔

”تمہیں احساس نہیں کہ تمہیں تلاش کرنے میں ہمارا وقت پہلے ہی ضائع ہو چکا ہے“ فریدوں نے صف کو گھور کر

دیکھا۔۔۔۔۔“

”یہ کون لوگ ہیں۔۔۔۔۔“ سستی نے ست لہجے میں کہا۔

”اور تم کون ہو“ رمیلہ بولی۔

”میں سستی اور یہ جو لیٹی ہے میری بہن کاہلی۔۔۔۔۔“ سستی نے جواب دیا پھر بولی ”تم لوگ شاتم نہیں جانتے کہ اب

صف نے بھی ہمارے ساتھ رہنے کا ارادہ کر لیا ہے“

”کیا؟“ تقریباً سبھی کے منہ سے نکلا

”ہاں“ صف تکتے میں کہنی دے کر ہاتھ پر اپنا گال ٹکاتے ہوئے تساہل سے بولی ”میں ان دونوں بہنوں کے ساتھ یہیں رہوں

گی۔ میں ان کے ساتھ بہت خوش ہوں۔“

”کیا تم مسرتوں کے شہر نہیں جاؤ گی“ کشت یار نے حیرانگی سے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ اس کی حیرانگی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔

”اور یہ کمر کا بوجھ“ واسقہ نے کہا۔

”اے رہنے دو۔۔۔۔۔۔۔۔“ کاہلی بولی۔ ”جب اسے ساری عمر کوئی کام دام ہی نہیں کرنا۔ تو پھر یہ بوجھ کیا تکلیف دے گا۔“

”بالکل“ سستی بولی۔ ”اس کا ہر کام بیٹھے بیٹھے اور لیٹے لیٹے ہوا کرے گا۔ یہ بوجھ کیا کہے گا اسے۔۔۔۔۔۔۔۔ پتہ بھی نہ چلے گا

اس کا۔۔۔۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔۔۔۔“ صفحہ خوشی سے بولی۔

سب حیران و پریشان صفحہ کو تک رہے تھے۔ جو بچوں کی طرح خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔

”تو تم ہمارے ساتھ نہیں چل رہیں۔۔۔۔۔۔۔۔“ کافی دیر بعد کشت یار بچھے بچھے لہجے میں بولا

”قطعاً نہیں“ صفحہ نے فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے ناک منہ چڑھایا۔۔۔۔۔۔۔۔ تم ہی جاؤ“

”صفحہ نے ہمارا ساتھ چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔“ واسقہ جھلا کر بولا۔

”اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔“ کشت یار نے غضب ناک لہجے میں کہا۔

”میری وجہ سے؟“ واسقہ غرایا۔

”تو اور کیا؟“ کشت یار غصے میں تھا۔

”میں نے کیا کیا۔۔۔۔۔۔۔۔ خواہ مخواہ مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔ میں برداشت نہیں کروں گا۔“ وہ غصے میں چیخا۔

”تم نے یہ کیا کہ جب میں نے تم سے کہا تھا صفحہ کو بلا لاؤ تو تم نے میری بات ان سنی کر دی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔“

”ان سنی نہیں کی تھی۔ میں نے گیر سے کہا تھا کہ اسے ڈھونڈ لائے۔“

”اور میں نے جواب دیا تھا۔“ گیر دلال پیلا ہو کر بولا۔ ”میں کوئی نوکر نہیں ہوں جو اسے ڈھونڈتا پھروں۔۔۔۔۔۔۔۔“

”کیا تھا گیر وجہ تم واسقہ کی بات مان لیتے۔ صفحہ پیچھے تو نہ رہ جاتی۔“ فریدوں نے مصالحت آمیز لہجے میں کہا۔

”تو تم چلے جاتے نا سے ڈھونڈنے۔“ گیرو چلے کئے لہجے میں بولا۔

”اگر واسقہ مجھے کہتا تو میں اس کی بات ضرور مان لیتا۔“ گیرو کی بات فریدوں کو بری لگی۔

”ہونہہ۔۔۔۔۔ دیکھتا میں کہ تم چلے جاتے“ گیرو پھنکارا۔

وہ سب آپس میں غصے، جھلاہٹ اور ناگواری سے باتیں کر رہے تھے۔ تینوں لڑکیاں بھی برہم برہم تھیں۔ کبھی وہ کشت یار کی طرف داری کرتیں۔ کبھی گیرو کی بات کاٹتیں۔

بہر حال

سب کے موڈ ناخوشگوار اور غصیلے تھے۔

وہ زور زور سے باتیں کرتے ایک دوسرے پر غصہ جھاڑتے چلے جا رہے تھے کہ اچانک ہی انہیں کچھ آوازیں سنائی دیں۔ کوئی زور و شور سے باتیں کر رہا تھا۔ یوں جیسے لڑائی ہو رہی ہو۔

”سنو“ کشت یار نے سب کو ہاتھ سے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کہا۔

”کوئی لڑ رہا ہے شاید۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ وہ دیکھو۔۔۔۔۔ وہ سامنے۔ آوازیں ادھر ہی سے آرہی ہیں۔۔۔۔۔“

سب نے ادھر دیکھا۔۔۔۔۔ دو عورتیں اور ایک مرد آپس میں لڑ رہے تھے۔ وہ کیا کہہ رہے تھے کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

کشت یار اور فریدوں جلدی سے آگے بڑھے اور ان میں بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کرنے لگے۔

”آ خربا ت کیا ہے؟“

”تم لوگ لڑ کیوں رہے ہو؟“

”کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔۔۔۔۔ شاید ہم مصالحت کروادیں“

”بھئی اب بس بھی کرو“

اب کشت یار اور فریدوں کے ساتھ باقی لوگ بھی آگے آ کر انہیں لڑنے سے روک رہے تھے۔

”تم ہو کون؟“ شاتم نے ایک عورت سے پوچھا۔

اب وہ تینوں الگ الگ کھڑے تھے۔ لڑنا بند کر دیا تھا۔ اس لیے وہ عورت بولی۔
”میں تلخی ہوں“

”اور میرا نام نفرت ہے“ دوسری عورت بولی۔

”اور یہ۔۔۔۔۔۔ یہ غصہ ہے“ عورت نے مرد کی طرف اشارہ کیا۔

ان سب نے دیکھا وہ تینوں انتہائی بد شکل اور مکروہ شکلوں والے تھے۔ غصے کا منہ لال سرخ آنکھیں پھیلی ہوئی اور برو چڑھے ہوئے تھے۔ دانت بڑے بڑے پیلے رنگ کے تھے۔ بات کرتا تو منہ سے جھاگ نکلتی تھی۔
تلخی بھی بد شکل اور بد ہیت سی تھی۔ اس کا چہرہ کھر دار تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور ہونٹ نوکیلے سے تھے۔ اس کی طرف دیکھتے ہی لگتا تھا حلق میں کڑواہٹ گھل رہی ہو۔

نفرت کا چہرہ بھی بد وضع تھا۔ اس کے چہرے پر کھچاؤ تھا۔ نتھنہ پھولے ہوئے تھے اور لگا تا پھڑک رہے تھے۔ وہ بار بار اپنے ہونٹ بھینچ لیتی۔ بیزاری کی کیفیت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔
ان سب نے لباس بھی عجیب و غریب قطع کے پہن رکھے تھے۔ جو گندے مندے بھی تھے۔
کشت یار نے ان کا تعارف ہونے کے بعد کہا ”ابھی آپ لوگ لڑ رہے تھے۔ اب ٹھیک ہو گئے ہیں۔ لڑ کیوں رہے تھے“
”بس لڑ رہے تھے“ غصہ بولا۔

بلا وجہ ہی ”فریدوں نے حیرانگی سے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔۔ یہ ہماری فطرت ہے“ تلخی بولی۔ ”ہم جہاں ہوتے ہیں۔ وہاں کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

”ہم جہاں اور جب اکٹھے ہوتے ہیں۔ لڑائی شروع ہو جاتی ہے“ نفرت بڑے زعم سے مسکرائی۔

غصہ خوشی سے سر ہلاتے ہوئے بولا ”ہم جہاں کہیں بھی پہنچ جائیں۔ لڑائی شروع ہونا لازمی ہے۔ یہ ہماری فطرت ہے اور فطرت

بدلتی نہیں۔۔۔۔۔۔“

نفرت ذو معنی انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ابھی تم لوگوں نے محسوس نہیں کیا؟“

”کیا؟“

”بالکل۔۔۔۔۔“ وہ ہنسا

”ان بوجھوں میں ہمارا بھی ہاتھ ہے نا“ تلخی ادا سے مسکرائی۔

سب حیران ہو کر ان کو دیکھنے لگے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کریں۔

”ہمیں جانے دو“ لرزتے کانپتے لہجے میں واسقہ بولا۔

”ہرگز نہیں۔ یہ ظلم کا علاقہ ہے۔ اور تم کو اس کے حضور حاضر کرنا ہمارا اور ہمارے چیلوں کا فرض ہے“ غصہ بولا۔

”ہم اپنا فرض دیانت داری سے ادا کرتے ہیں“ نفرت تمسخر سے بولی۔

”کسی کی آہ زاری ہمیں اپنے فرض کی راہ سے نہیں ہٹا سکتی۔ ہیں نا غصہ۔“ تلخی بڑے تلخ لہجے میں بولی۔

”بالکل۔ ہم اپنے آقا ظلم کے بااعدار اور وفادار ہیں۔۔۔۔۔“ غصے نے کہا۔

پھر

وہ

سب سے بولا ”چلو ظلم کے محل میں“

”نہیں۔۔۔۔۔“ سب چیخنے اور ایک دوسرے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”تو تم نہیں جاؤ گے“ غصہ غرایا۔

”نہیں۔۔۔۔۔“ وہ سب بولے۔

”چیلو۔ بڑھو اور انہیں گھسیٹتے ہوئے لے چلو“ غصے نے حکم دیا۔ تو لال لال زبانیں کالے کالے ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے وہ مکروہ

شکل حبشی آگے بڑھے۔ ہر ایک کا ہاتھ پکڑ کر انہوں نے گھسیٹنا شروع کر دیا۔ لڑکیاں رونے لگیں۔ مرد خوفزدہ ہو گئے۔ فریدوں اور گیرو

کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان چیلوں کے منہ نوج لیں۔۔۔۔۔“

تھوڑی دور تک سب گھسیٹتے چلے گئے

اور

جب کشت یار نے دیکھا کہ ان کے ساتھ جائے بنا چارہ نہیں تو وہ زور سے چلایا۔

”مت گھسیٹو ہمیں ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔ چلو۔۔۔۔۔“

”تو پھر۔۔۔۔۔۔۔۔“ کشت یارہمت کر کے بولا۔

”تو جاؤ نیچے اتر و مرو۔۔۔۔۔۔۔۔“ غلام غصیلے لہجے میں بولا ”میں یہیں رکتا ہوں۔

تم جا کر ظلم کے ان تہہ خانوں کا معائنہ کر لو۔۔۔۔۔۔۔۔“

”تم نہیں چلو گے ساتھ۔۔۔۔۔۔۔۔“ کشت یار نے پوچھا۔

”نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ نگل آ گیا ہوں معائنہ کرا کر کے۔ تم خود جا کر دیکھ لو۔ اسی زینے سے لوٹ آنا۔ میں یہیں ہوں

گا۔۔۔۔۔۔۔۔“

سب تذبذب میں تھے۔ اندھیرے اور بدبودار تہہ خانوں میں اترنے جھجک آ رہی تھی۔ اللہ جانے یہ کیا ترکیب ہوا نہیں

پھنسانے کی؟

لیکن

جب غلام نے پھر غصے سے انہیں نیچے جانے کو کہا۔ تو سب جانے کو تیار ہو گئے اسی طرح سب نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ

رکھے تھے۔ کشت یار سب سے آگے تھا۔ وہ دھڑکتے دلوں اور پسینہ پسینہ ہوتی پیشانیوں کے ساتھ ایک دوسرے کے پیچھے زینے سے

اترنے لگے۔

ہر طرف گھمبیر اندھیرا تھا۔ سلین زدہ بیڑھیاں بدبودار تھیں۔ زینہ لوہے کا تھا۔ اور اس میں کئی گھماؤ تھے۔

زینہ اتر کو وہ راہداری میں آ گئے۔ یہاں نسبتاً روشنی تھی۔ جو دور کے ایک بڑے سے سوراخ سے اندر آ رہی تھی۔ اس روشنی کو

انہوں نے نفیست جانا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راستہ تلاش کرنے لگے۔

ان کے قدم ٹھنک گئے۔ جب ان کے کانوں میں دور سے آتی بین اور آہ وزاری کی صدا محسوس اتریں۔

”کوئی رو رہا ہے“

”سخت تکلیف میں ہے شاید۔۔۔۔۔۔۔۔“

”لگتا ہے کوئی کچھ کے دے رہا ہے کسی کو“

وہ دم سادھے قیاس آرائیاں کرتے آگے بڑھ رہے تھے۔ اب رونے دھونے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

وہ ڈرتے ڈرتے قدم بڑھائے آگلی راہداری میں چلے آئے۔ یہ راہداری کچھ چوڑی اور روشن تھی۔ اور اس کے دونوں طرف قید

خانے بنے ہوئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں تھیں۔ جن کے دروازے جنگلے دار لوہے کے تھے۔

ان کوٹھڑیوں ہی سے آہِ فغان اور بین کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ دم سادھے بے آواز قدموں سے چلتے آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک کوٹھڑی سے خوفناک چیخوں کی آواز سنائی دی۔ وہ سب بے حد خوفزدہ ہو کر بھاگنے کو تھے کہ دائیں ہاتھ کے درپچے سے آواز آئی۔

”سنیے“

یہ ایک سریلی اور دل موہ لینے والی آواز تھی۔ سب نے پلٹ کر درپچے کی طرف دیکھا وہاں ایک بے حد پیاری لڑکی صاف ستھرا لباس پہنے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر تقدس کا نور تھا۔ آنکھیں روشن اور صاف و شفاف تھیں۔ وہ بہت ہی پیاری اور دل آویز مسکراہٹ لبوں پر سجائے ہاتھ کے اشارے سے انہیں اپنی طرف بلا رہی تھی۔ اس گھٹے ہوئے وحشت ناک ماحول میں کسی مقدس چہرے کا نظر آنا ان سب کے لیے حیران کن تھا۔

”

سب درپچے کی طرف بڑھے۔

”آپ کون ہیں۔۔۔۔۔۔“ شاتم گھگھیائی

”میں ہمدردی ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔ ادھر آ جاؤ۔۔۔۔۔۔“ لڑکی نے پیاری سی مسکراہٹ سے کہا۔

پھر بولی ”آپ سب یہاں کیسے آ گئے۔ یہ تو ظلم کے تہہ خانے ہیں۔۔۔۔۔۔“

کشت یار نے جلدی جلدی اسے اپنے یہاں تک آنے کی کہانی کہہ سنائی۔

”اوہ لڑکی کے لبوں سے نکلا۔۔۔۔۔۔“ لیکن فکر نہ کریں۔ میں اور میرے بہن بھائی آپ کو اس عقوبت خانے سے نکال

لیں گے“

”کیا واقعی“ سب نے بے یقینی سے کہا۔

”ہاں۔“ وہ بولی ”میرا بھائی امن ہے اور بہن محبت۔ ہم تینوں ظلم کے ہاتھوں ستائے جانے والوں کی مدد کے لیے کمر بستہ رہتے

ہیں۔“

”وہ کہاں ہیں؟“ رمیلہ بولی۔

”ہاں۔۔۔۔۔“ اس دفعہ گیرو کے ساتھ فریدوں شاتم اور سیبہ بھی چنچ اٹھے۔ رمیلہ ڈری ڈری کشت یار کے ساتھ لگی رہی۔

”حیرت ہے، ظلم نے اپنی خوفناک سرخ سرخ آنکھیں گھمائیں۔ پھر بس کر بولا ”میں تو اس وہم میں مبتلا تھا کہ میں تم لوگوں کو

بہت پسند ہوں۔ اسی لیے تو میں ہمیشہ تم لوگوں کے قریب رہتا تھا۔۔۔۔۔“

”بکو اس بند کرو۔۔۔۔۔“ اس بار پھر گیرو چیخا ”ہم نے اس سے پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔۔۔۔۔ جھوٹے

مکار۔۔۔۔۔“

ظلم نے ایک گوشہ دار قہقہہ لگایا۔ جب اس کی گونج رکی تو وہ سب کو خوفناک نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ”جھوٹ تم بول

رہے ہو۔ ارے کم بختو یاد کرو میں اس وقت تمہارے کتنا قریب تھا۔ جب تم قہصو کی پھل کی ریڑھی لوٹ رہے تھے۔ اور وہ وقت بھی

یاد کرو۔ جب تم نے ایک گدھا گاڑی کے گدھے کی ٹانگوں پر پتھر مارا تھا۔ گاڑی بان الٹ کر گر پڑا تھا۔ اور۔۔۔۔۔

اور۔۔۔۔۔ وہ لنگڑا کتا یاد ہے جسے پتھر مار مار کر تم سب نے زخمی کر دیا تھا۔ میں اس وقت تمہارے پاس تھا۔ اور تم سے بے حد

خوش ہو رہا تھا۔

بچوں نے حیرانگی سے اسے دیکھا ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ حیران تھے کہ ان کے یہ مشغلے ظلم کو کیسے پتہ چلے؟

کشت یار اور واسقہ بھی حیران ہو ہو کر ظلم کو تک رہے تھے۔ جو بڑے مزے سے ان کی حیرانگی اور گھبراہٹ پر مسکرا رہا تھا۔

”اور کشت یار۔۔۔۔۔“ ظلم اپنے جڑوں سے نکلتی جھاگ کو اپنی بالوں بھری الٹی ہتھیلی سے صاف کرتے ہوئے ہنسا ”تم

حیران کیوں ہو رہے ہو۔ میرا اور تمہارا تو بہت پرانا ساتھ تھا۔ کوئی ایک واقعہ ہو تو یاد بھی کراؤں۔ تم نے تو قدم قدم پر میرا ہاتھ

تھاما۔۔۔۔۔ وہ بوڑھی بیوہ عورت۔۔۔۔۔ جسے تم نے در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کیا۔ اس کا گھر چھین لیا۔۔۔۔۔“

اس نے کشت یار کے ظلم و ستم کے کئی واقعات بیان کر دیئے۔

پھر

واسقہ کی طرف دیکھ کر تمسخر سے ہنسا ”تم تو میرے پرانے دوست ہو۔ تین بھائیوں کا حصہ کھا گئے۔ جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ پھر انا

انہیں سزا بھی دی۔ کیوں یاد ہے نا۔۔۔۔۔“

”

واسقہ کے ظلم کی داستاںیں بھی سنانے لگا۔

اس کے بعد شام باہر نکلی۔

فریدوں اور گیرو کو باہر نکالنے کے بعد واسقہ باہر آیا۔

اور

آخر میں کشت یار۔

سب کے کپڑوں کو کچھ مٹی وغیرہ لگی۔ کشت یار کی کہنی پر ہلکا سا زخم آیا اور واسقہ کی ٹانگ ذرا اچھل گئی۔

لیکن

وہ سب اب سوراخ سے باہر اور ظلم کے ہاتھوں سے محفوظ تھے۔

”اب تم لوگ جلدی کرو۔ اور اس علاقے سے نکل جاؤ“ امن نے انہیں سیدھا راستہ دکھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں تیز تیز بھاگو۔ اور ظلم کے علاقے سے نکل جاؤ“ ہمدردی بولی۔

محبت نے ایک نگاہ ان پر ڈالی اور بولی ”تم بہت جلدی اسی راستے پر پہنچ جاؤ گے جہاں سے تمہیں اپنے مسرتوں کے شہر کے راستے

پر ہولینا ہے“

کشت یار اور اس کے ساتھیوں نے ان تینوں کا شکریہ ادا کیا۔ اپنے کپڑے جھاڑے۔

اور

امن کے بتائے ہوئے راستے پر تیزی سے بھاگنے لگے۔

وہ مڑ مڑ کر دیکھتے بھی جاتے تھے۔

انہیں ہمدردی محبت اور امن کے پر نور اور مقدس چہرے دور تک نظر آتے

رہے

دوڑتے

بھاگتے

وہ اس راستے پر آگئے۔ جس پر وہ پہلے چل رہے تھے۔ جو سیدھا جاتا تھا اور جس پر چلنے کی انہیں رہبر بابا نے تاکید کی تھی۔

ان کے سانس بھول رہے تھے۔ ٹانگیں شل ہو رہی تھیں۔ اب تیز چلنا تو کیا ان سے قدم اٹھانا بھی مشکل تھا۔

”سیہ تم مجھ سے اور قریب ہو جاؤ۔۔۔۔۔“

”پھر بھی۔۔۔۔۔ کیا تم نہیں ڈر رہے۔۔۔۔۔“

”کس بات سے؟“

”رات اندھیری ہے۔ اور ہم تنگی زمین اور کھلے آسمان تلے سونے کی کوشش کر رہے ہیں۔۔۔۔۔“

”چپ ہو جاؤ۔ ہم درختوں کے نیچے ہیں ہمارے نیچے سبز سبز ملائم ملائم گھاس کے بستر ہیں بس سونے کی کوشش کرو۔

شباباش۔۔۔۔۔ سو جاؤ۔ میں تمہیں تھپکتا ہوں تم آنکھیں بند کر لو۔۔۔۔۔“

”گیرو۔ تمہارے ہاتھ کیوں لرز رہے ہیں۔ لگتا ہے تم بھی ڈر رہے ہو“

اور

گیرو کی بجائے قریب ہی لیٹی شاتم خوفزدہ لہجے میں بولی ”مجھے بھی نیند نہیں آرہی۔ ڈر لگ رہا ہے“

”ڈر سب ہی کو لگ رہا ہے“ فریدوں نے ہولے سے کہا ”یہ دیکھو میلہ مجھ سے چمٹی جا رہی ہے“

”کیا باتیں ہو رہی ہیں تم لوگ سو کیوں نہیں رہے“ کشت یار نے قدرے ڈانٹ بھرے لہجے میں کہا۔ سب نے محسوس کیا کہ ڈر

اس کی آواز میں بھی موجود تھا۔

کچھ یہی حال واسقہ کا بھی تھا۔ جو کہنی میں منہ دیئے اوندھا لیٹا تھا۔ وہ سب ہولے ہولے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ہی

درخت کے پیچھے سے اک مہین سے لرزتی کانپتی آواز آئی ”کیا ہو رہا ہے؟“

”کو۔۔۔۔۔ کون؟“ سب بری طرح چونکے۔

”میں ڈر ہوں“ درخت کے پیچھے سے وہی مریل سا کالا گلوٹا بچہ نکل کر ان کے سامنے آ گیا جو انہوں نے ظلم کے قدموں میں بیٹھے

دیکھا تھا۔

سب بری طرح سہم گئے۔ مارے ڈر کے وہ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔

”تم۔۔۔۔۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو“ واسقہ نے ہمت کر کے پوچھا اور کوشش کی کہ اس کی آواز سے ڈر ظاہر نہ ہو۔ لیکن وہ

اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

”میں ادھر ادھر چکر لگا تا ہی رہتا ہوں“ بچہ مریل آواز میں بولا۔

”کیا تمہیں ظلم نے بھیجا ہے۔۔۔۔۔۔“ فریدوں کی حالت دگرگوں تھی۔ بچے چند لمحے چپ رہا۔

بولتا ”آں۔۔۔۔۔۔ ظلم نے تو مجھے نہیں بھیجا۔۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔۔ میں تم لوگوں کے متعلق اسے بتا ضرور سکتا ہوں“
ڈر سے سب کو پھریری سی آگئی۔

”لیکن۔۔۔۔۔۔“ کشت یار ہکلا یا۔

”لیکن ویکن کیا“ ڈر بڑے ترش لہجے میں بولا۔ پھر خود ہی ہنس دیا اور کہنے لگا ”جانتے ہو۔ جو لوگ ظلم کی قید سے فرار ہوتے ہیں۔ پکڑے جانے کے بعد وہ ان سے کیا سلوک کرتا ہے“

ڈر کے مارے سب کے چہرے سپید پڑ گئے۔ وہ کسی طور اب ظلم کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہتے تھے۔

ڈر نے انہیں پریشان دیکھا تو مزے لے لے کر ظلم کے کارنامے انہیں سنانے لگا

”ظلم ایسے لوگوں کی کھالیں کھنچوا دیتا ہے“

”ایسے لوگوں کو وہ جلتی ہوئی بھٹی کا ایندھن بھی بنا دیتا ہے“

”میں نے اسے لوگوں کو کچا چباتے ہوئے بھی دیکھا ہے“

”آ نکھیں نکلوادینا تو بہت معمولی سزا ہے“

”کبھی کبھی تو وہ لوگوں کو سینوں پر چڑھا کر آگ پر سینکتا ہے اور کباب سمجھ کر کھاتا ہے“ بچے ڈر کے مارے سبے جا رہے تھے۔

رمیلہ تو تھر تھر کانپتے ہوئے فریدوں سے چمٹی جا رہی تھی۔ شاتم اور سیبہ کا بھی برا حال تھا۔ بچے تو بچے کشت یار اور واسقہ کا بھی کانٹو

تو بدن میں اب نہیں تھا۔

ساری رات ڈر انہیں ڈراتا رہا۔

ظلم کی ایسی ایسی داستاںیں سنائیں کہ یہ بچہ رے زرد پڑ پڑ گئے۔ وجود تھر تھر کانپتے رہے۔ رمیلہ، شاتم اور سیبہ کی تو کئی بار چیخیں

نکل گئیں۔ وہ آنکھیں بند کر لیتیں۔ لیکن کالے کلوٹے مریل سے بچے کو وہ بند آنکھوں سے بھی دیکھ سکتی تھیں۔ اندھیرا تھا۔ پھر بھی وہ

سب کو برابر نظر آ رہا تھا۔

رات گزر گئی۔

گوشتہ مشرق سے ہلکی ہلکی روشنی نظر آنے لگی۔

وہ سب جو بڑے انہماک سے ڈرکودیکھ رہے تھے اور پریشان ہو رہے تھے۔ انہوں نے حیرت سے دیکھا کہ روشنی کے جاتے ہی ڈر پکھلنے لگا تھا۔

وہ

آہستہ

آہستہ

پکھل رہا تھا۔

”ارے۔۔۔۔۔ تم کہاں غائب ہو رہے ہو“ بے اختیار نہ گیرو کے منہ سے نکلا۔ پکھلتے تو دے سے آواز آئی ”بس میرا تمہارا ساتھ رات کے اندھیرے تک ہی تھا دن کی روشنی میں میں اکثر غائب ہو جاتا ہوں۔۔۔۔۔“

اس کے ساتھ ہی وہ پورے کا پورا پکھل گیا۔

ڈر کے غائب ہوتے ہی سب اپنے ہوش و حواس میں آ گئے۔ انہیں اپنے ذہنوں پر چھایا ڈر زائل ہوتا محسوس ہوا

”شکر ہے“ واسقہ نے اک انگڑائی لی ”ڈرنے ہمیں ساری رات پریشان رکھا“

”ہائے۔۔۔۔۔ میرا تو دل لگتا تھا تھم ہی جائے گا۔۔۔۔۔ شکر ہے وہ غائب ہو گیا“ شاتم نے سکون کا سانس لیا۔

اب دن کی روشنی پوری طرح پھیل گئی تھی۔ سب اٹھ گئے۔ ڈرنے انہیں رات بھر پریشان کیا تھا۔

کشت یار نے اٹھ کر ادھر ادھر نگاہ ڈالی پھر بولا ”دیکھو تو۔۔۔۔۔“

”کیا؟“

”ہم ظلم کے علاقے سے بہت دور نکل آئے ہیں۔ وہ تو بہت پیچھے رہ چکا ہے“

”ہاں واقعی۔ یہ علاقہ تو ویسا نہیں جیسا ظلم کا تھا“

”بالکل“

”اور یہ ڈر؟“

”یہ خواہ مخواہ ہمیں ڈراتا رہا۔ اس نے ظلم کا خوف ہم پر رات بھر طاری رکھا“

”اسی لیے تو صبح ہوتے ہی ہم پھر سے بہادر بن گئے۔ ڈر چلا جو گیا“
 ”ڈرا کثر رات کے اندھیروں ہی میں خوفزدہ کرتا ہے“ کشت یار نے کہا۔
 ”ہاں۔۔۔۔۔۔“ واقعی۔“

سب اب تروتازہ تھے۔ خوف ذہنوں سے دور ہو چکا تھا۔ وہ سفر پر روانہ ہونے کے لیے کمر بستہ تھے۔
 ”چلیں؟“ کشت یار نے سب سے پوچھا۔

”ہاں دن نکل آیا ہے ڈر غائب ہو چکا ہے ظلم کی بستی ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔
 ”آگے ہی آگے جانا ہے نا۔۔۔۔۔۔“ فریدوں چہک کر بولا۔

”اور جلدی کسی بستی تک بھی پہنچنا ہے“ واسقہ نے کہا ”کھانے پینے کا بھی تو بندوبست کرنا ہے۔۔۔۔۔۔“
 ”بھوک تو ابھی سے لگ رہی ہے“ شاتم بولی۔

”لیکن اب ہم پھلوں پر گزارہ نہیں کریں گے کسی بستی میں پہنچ کر انڈے پرائٹھے اور دودھ کا ناشتہ کریں گے“ گیرونے زبان پر
 چٹخارہ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”تو چلو پھر“ فریدوں بولا۔
 ”چلو“ کشت یار نے کہا۔

اور

سب

آگے پیچھے چلنے لگے۔

انہیں بہت دیر چلنا پڑا۔

کیونکہ راستہ سنسان تھا۔ اور دور و نزدیک کوئی بستی نہ تھی۔ جہاں رک کر وہ ناشتہ وغیرہ کر لیتے۔
 انہیں بہت دیر چلنا پڑا۔

کیونکہ راستہ سنسان تھا۔ اور دور و نزدیک کوئی بستی نہ تھی۔ جہاں رک کر وہ ناشتہ وغیرہ کر لیتے۔
 ”میں تو تھک گئی“ سیبہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھک گئی۔

”چلنا تو پڑے گا۔ چاہے تھوک چاہے نہ تھکو“ شاتم خود بھی ہانپ رہی تھی۔

”ہمت سے کام لو۔ دیکھو تو رمیلہ کیسے چھلانگیں مارتی جا رہی ہے“ فریدوں بولا۔ ”اس نے صبح کچھ کھاپی لیا ہوگا“ گیرونے کہا

”یار بھوک کے مارے میرا بھی برا حال ہے“

”بچو۔۔۔۔۔۔“ کشت یار ملائمت سے بولا۔۔۔۔۔۔ ”ہمت نہیں ہارو۔ جلدی جلدی قدم اٹھاؤ ہو سکتا ہے ہم کسی بستی کے

قریب ہی ہوں۔۔۔۔۔۔“

”آثار تو نظر نہیں آتے۔۔۔۔۔۔“ واسقہ بولا۔

”اس راستے پر اچانک ہی بستیاں نظروں کے سامنے آ جاتی ہیں“ کشت یار نے کہا ”یہ بہت پرانی گزرگاہ ہے اور کچھ کچھ فاصلے

پر بستیاں موجود ہیں۔ تم اس بات کا مشاہدہ کر چکے ہو“

”لیکن اب تو کچھ نظر نہیں آتا“ سیبہ نے کہا۔

”بھی تمہاری رفتار سست پڑ گئی ہے۔ تیز تیز چلو۔ جلد ہی کوئی بستی نظر آ جائے گی کشت یار نے ملائمت سے کہا۔

”اچھا۔۔۔۔۔۔“ سب نے کہا اور ہمت کر کے تیز تیز قدم اٹھانے لگے۔

اب سورج نکل آیا تھا۔ اور اس کی حدت چہرہ رہی تھی۔ یہ لوگ بھوکے پیاسے تھے۔ رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ اور

کمرؤں پر بوجھ کے گٹھڑ بھی لدے تھے۔ چلنا نہیں جا رہا تھا۔ لیکن چلنا بھی تھا۔

”اب راستہ تنگ ہوتا جا رہا ہے“ معا فریدوں نے سمٹی سڑک دیکھ کر کہا۔

”جا بجا کنکر اور پتھر بھی ہیں۔۔۔۔۔۔“ گیر و بولا۔

”ہو سکتا ہے کوئی بستی قریب ہو“ شاتم بولی۔

”ہاں۔ وہ دیکھو۔ سامنے دائیں طرف۔ گھر نظر آ رہے ہیں۔“ واسقہ نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔۔“ ہاں نے اچھل اچھل کر تالیاں بجائیں۔

پھر

سب کے رخ ان گھروں کی طرف مڑ گئے۔

جلد ہی وہ اس بستی میں جا پہنچے۔ جہاں چھوٹے چھوٹے کچے اور بوسیدہ مکان تھے۔

”کس دروازے پر دستک دی جائے۔۔۔۔۔“ واسقہ نے کشت یار سے پوچھا۔ جو کبھی بڑے اور عالیشان مکان کو دیکھ رہا تھا اور کبھی چھوٹے اور پر وقار کو

”میں تذبذب میں ہوں“ کشت یار بولا۔

”کیوں“ واسقہ نے پوچھا۔

”مجھ نہیں پارہا کہ کس دروازے پر دستک دوں۔۔۔۔۔“

فریدوں جھٹ سے بولا۔ ”یہ عالیشان مکان تمہارے شان شایان ہے یقیناً تم یہی دروازہ کھٹکھٹاؤ گے۔۔۔۔۔“

”اسی لیے تو تذبذب میں ہوں“ وہ بولا۔ پھر اس نے پچھلا واقعہ یاد کرتے ہوئے کہا ”میں تلخ تجربے سے گزر چکا ہوں۔ بی رحمی کو چھوڑ کر میں امیر آدمی کے ہاں راستہ گزارنے گیا تھا۔۔۔۔۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ پھر تو بے دھڑک دوسرے دروازے پر دستک دینا چاہیے“ گیر بولا۔ ”وہ تو اتنا خاموش ہے لگتا ہے نہیں گھر پر کوئی ہوگا۔ البتہ اس شاندار مکان سے بولنے چاہئے اور شور سنائی دے رہا ہے۔۔۔۔۔“ شاتم نے کہا۔

واسقہ آگے بڑھتے ہوئے بولا ”بھئی دستک دینے میں کیا حرج ہے۔ کوئی اندر ہوا۔ تو دروازہ کھول دے گا۔ نہیں تو خیر۔۔۔۔۔“

”تو بڑھ کر کھٹکھٹاؤ۔۔۔۔۔“ کشت یار نے کہا۔

واسقہ نے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔

”ٹھیک ہے“ کشت یار نے سب کی طرف دیکھا ”ہم اسی گھر میں پناہ لیں گے“

”کیا ضروری ہے“

”ہاں“

”کیوں“

”ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ مجھے اس کا تجربہ اس سفر کے دوران ہوا ہے۔ چلو اس مکان کی طرف واسقہ نے دستک دی ہے۔۔۔۔۔“

واسقہ کو دوسری بار دستک دینے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ دروازہ کھل گیا اور ایک معمر آدمی جس کا لباس صاف ستھرا جس کا لباس

صاف ستھرا اور شکل صورت سے انتہائی مہذب دکھائی دیتا تھا سامنے آیا۔

وہ سب اب دروازے کے قریب پہنچ چکے تھے۔

معمر آدمی انہیں دیکھ کر مسکرایا اور سر ہلاتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔ ”آپ لوگ غالباً مسافر ہیں۔۔۔۔۔۔۔“

”جی“ رمیلہ جو داستہ کے پہلو میں کھڑی تھی جھٹ سے بولی۔

”آئیے“ معمر آدمی نے بڑے آرام سے ایک طرف ہو کر ہاتھ کے اشارے سے انہیں اندر آنے کے لیے کہا۔

سب آگے پیچھے اندر داخل ہوئے۔

انہوں نے دیکھا کہ یہ ایک انتہائی خوبصورتی سے آراستہ آرام دہ اور پرسکون گھر تھا۔ طویل برآمدے سے ہوتے ہوئے وہ سب بڑے کمرے میں آ گئے۔ جس میں آرام دہ نشستیں تھیں۔ فرش پر ہلکے سبز رنگ کا قالین بچھا تھا۔ کھڑکیوں پر ریشمی پردے لہرا رہے تھے۔ کمرہ ہلکی سبز روشنی میں ڈوبا لگتا تھا۔ جس سے رگ رگ میں سکون کی کیفیت دوڑتی محسوس ہوتی تھی کمرے میں دو گدی ملی نشستوں پر دو خواتین بیٹھی تھیں۔ ان کے لباس ریشمی تھے۔ اور ہلکا ہلکا زریں رنگ کا زیب تن تھا۔ ان کے چہرے خوبصورت تھے۔ اور ملامت اور شفقت کی پھوار برس رہی تھی۔

”آئیے تشریف رکھئے“ معمر بزرگ نے مہمانوں کو اندر آ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سب آ کر گدی ملی چمکدار نشستوں پر بیٹھ گئے۔

معمر آدمی نے کشت یار سے کہا ”غالباً آپ کسی لمبے سفر پر نکلے ہوئے ہیں۔ اور یہ سب آپ کے ساتھی ہیں۔“

”ہاں معزز بزرگ“ کشت یار نے اتنی ملامت سے کہا کہ سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اس کے مزاج میں کتنی واضح

تبدیلی آ چکی تھی۔

”کہاں جا رہے ہیں کیا مسرتوں کا شہر آپ کی منزل ہے“ معمر بزرگ نے کہا۔

”آپ کو کیسے پتہ چلا“ سیبہ ایک دم بول اٹھی۔

”بیٹا۔ آپ کی پشتوں پر لدے بوجھ دیکھ کر اس علاقے کا ہر ایک شخص جان سکتا ہے“ معمر آدمی مسکرایا۔

”آپ کون ہیں۔۔۔۔۔۔۔“ فریدوں نے سوال کیا۔

”میرا نام سکون ہے۔۔۔۔۔۔۔“ معمر آدمی مسکرایا۔ ”اور یہ دو خواتین جو بیٹھی ہیں نا۔۔۔۔۔۔۔“ اس نے پرلی نشستوں پر

بیٹھی دونوں عورتوں کی طرف اشارہ کیا۔ جواب ان کی طرف بڑے اٹہاک اور پیار سے دیکھ رہی تھیں۔

”جی۔۔۔۔۔“ وہ بولا۔

”ان میں سے ایک جو ہلکے فاختی لباس میں ہے۔ وہ میری بیوی ہے اس کا نام سنجیدگی ہے۔ اور دوسری عورت میری بہن ہے بردباری۔۔۔۔۔ ہم تینوں اس گھر میں بڑے سلوک پیار اور محبت سے رہتے ہیں۔“

معمر آدمی نے بات ختم ہی کی تھی کہ برابر والے عالی شان مکان سے زور زور کی آوازیں آنے لگی۔ شور و غل مچ گیا سبھی چونک گئے۔

”معمر آدمی مسکرایا ”یہ آوازیں ساتھ والے گھر سے آرہی ہیں۔۔۔۔۔“

”ادھر کون رہتا ہے“

”اس گھر کے مالک کا نام شور ہے اور اس کی بیوی لڑائی ہے۔ ان کے ساتھ ان کا بھائی جھگڑا بھی رہتا ہے۔“ معمر آدمی نے کہا۔

اب

وہ دونوں عورتیں بھی اٹھ کر ان کے پاس آگئیں۔ سب نے اپنا تعارف ان سے کروایا۔ وہ بڑے شفیق لہجے میں باتیں کر رہی تھیں۔

”آپ لوگ گھبرائیے نہیں“ بردباری بولی ”یہ تو برابر والوں کا روز کا کام ہے۔ ہر وقت لڑائی۔ ہر وقت جھگڑا۔۔۔۔۔ شور مچا رہتا ہے۔ ان کے بچے بھی آپس میں ہر وقت لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کا مارتے پیٹتے اور گالیاں بکتے ہیں۔ یہ میاں بیوی تو کسی پل سکون سے بیٹھتے ہی نہیں۔۔۔۔۔“

”اور جو کوئی بھولا بھلا مسافر ان کے گھر آ جائے سنجیدگی کانوں کو ہاتھ لگا کر سر ہلاتے ہوئے بولی ”پناہ ہے۔ اس کا وہ حشر کرتے ہیں کہ تو بے۔۔۔۔۔ بیچا ہر مہمانداری تو کروا نہیں پاتا نیم پاگل ضرور ہو جاتا ہے۔“

کشت یار اندر ہی اندر کانپ گیا۔ اس کے باقی ساتھیوں نے اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں ”بیچ گئے۔“

معمر آدمی بولا ”نہ صرف نیم پاگل کر دیتے ہیں۔ بلکہ گھر سے نکلنے بھی نہیں دیتے۔“

”ہائے“ شاتم نے سینے پر ہاتھ مارا ”شکر ہے ہم ان کے دروازے پر دستک نہیں دی“

”حالانکہ وہ گھر اس گھر سے زیادہ بڑا اور شاندار تھا۔ ہمارے کشت یار نے بالکل صحیح فیصلہ کیا اور ہمیں اس گھر لے جانے کی

بجائے یہاں لے آیا۔ گہرو نے کشت یار کی تعریف کی۔

”بہت اچھا کیا“ بردباری بولی۔

”ان کا گھر باہر سے اتنا شاندار ہے“ کشت یار نے کہا۔ ”لیکن“

سنجیدگی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”اندر سے دیکھو۔ تو بالکل پاگل خانہ لگتا ہے۔ کوئی چیز سلامت نہیں۔ ہر کمرہ لڑائی کا

اکھاڑہ ہے۔۔۔۔۔۔“

سنجیدگی اور بردباری اس گھر کے متعلق انہیں بتاتی رہیں۔ وہ بچوں سے بہت پیار کر رہی تھیں۔ شاتم، سیبہ اور رمیلہ کو تو انہوں نے

بہت پیار کیا۔

”بھئی“ معمر آدمی بولا۔ ”ہم لوگ باتوں میں بھول ہی گئے کہ مہمانوں کی خاطر تو واضح بھی کی جاتی ہے“

”اوہ۔۔۔۔۔۔“ سنجیدگی اٹھتے ہوئے بولی ”واقعی یہ لوگ مسافر ہیں۔ بھوکے پیاسے ہوں گے“ کشت یار نے تکلفاً کہا

”نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔۔“

”نہیں نہیں۔۔۔۔۔۔“ بردباری بھی اٹھی ”کچھ کھایا پیابھی ہوگا تو سویرے سویرے اب تو دوپہر سر پر آ چکی ہے۔ وہ سب

کچھ ہضم ہو گیا ہوگا۔ ہم ابھی آپ کے لیے کھانا لاتے ہیں۔۔۔۔۔۔“

وہ دونوں کمرے سے نکل گئیں

معمر شخص ان سب سے باتیں کرنے لگا۔ برابر والے گھر سے شور وغل کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔ کبھی تو چیخنے چلانے کی

آوازیں اتنی تیز ہوتیں کہ ان کے ہاتھ بے اختیار انہ کانوں کی طرف اٹھ جاتے۔

سنجیدگی اور بردباری تھوڑی دیر کے بعد واپس آئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے ملازم تھے۔ جنہوں نے کھانے کے خوان اٹھا رکھے

تھے۔

بھوک سے سب بے حال تھے۔ کھانے کی مہک نے اشتہاء بڑھا دی۔ لیکن وہ سب سکون سے بیٹھے رہے۔

ملازموں نے میزوں پر کھانا چن دیا۔ پینے کے لیے صاف اور ٹھنڈے پانی کے علاوہ لیموں کے مشروب بھی رکھے۔

”نوش فرمائیے“ معمر آدمی نے سب کو کھانا کھانے کی دعوت دی۔

کچھ دیر تو سب نے تکلفاً ہاتھ کھینچنے لیکن بھوک ایک حقیقت تھی۔ وہ سب کھانے پر ٹوٹ پڑے۔

اور

مزید اور پر لطف کھانا باتوں کے درمیان پیٹ بھر کر کھایا۔

کھانے کے بعد معمر بزرگ انہیں دوسرے کمرے میں لے گیا ”یہاں آپ تھوڑی دیر آرام کریں۔ شام کو میں آپ کو جگالوں

گا“

”لیکن ہمارا سفر-----“ کسی نے کہا۔

”کل صبح ناشتہ کر کے اپنے سفر پر روانہ ہو جائے گا۔ آپ بہت تھکے ہوئے ہیں اور ابھی آپ کو دور جانا ہے“ معمر آدمی بولا۔

”ٹھیک ہے“ سب نے کہا۔

اور

پھر وہ سکون کا تہہ دل سے شکر یہ ادا کرنے لگے۔

شام وہ سو کر اٹھے تو بے حد تازہ دم تھے۔ رات کا کھانا بھی پر تکلف تھا۔ انہوں نے مزے لے لے کر کھایا۔

اور

پھر

رات

نرم اور ملائم بستروں میں پڑ کر وہ اتنے بے خبر ہو کر سوئے کہ صبح طلوع ہو گئی تب بھی ان کی آنکھ نہ کھلی۔

سکون ہی نے انہیں جگایا کہ ان کے لیے ناشتہ تیار کیا جا رہا تھا۔

ملازموں نے ان کے نہانے کے لیے پانی رکھ دیا ہوا تھا۔ ان کے کپڑے جھاڑ کر صاف کرنے کے لیے بھی وہ تیار کھڑے تھے۔

سب نے غسل کر کے کپڑے پہنے۔ بال بنائے اور ناشتہ کرنے کے لیے کمرے میں آ گئے ”اتنا سکون ملا ہے کہ بتا نہیں سکتے“

کشت یار بولا۔

”گلتا ہے سفر کی صعوبتیں برداشت ہی نہیں کیں-----“ واسقہ بولا۔

”بالکل ہلکے پھلکے ہو گئے ہیں-----“ کشت یار نے کہا ”یہ پشتوں کے بوجھ بھی گلتا ہے ہلکے ہو گئے ہیں-----“

”مجھے تو گلتا ہے یہی مسرتوں کا شہر ہے“ رمیلہ نے کہا تو سنجیدگی نے بڑھ کر اسے ساتھ لپٹا لیا۔ اور بولی ”خدا کرے تمہارا سفر جلد ختم

”ہاں۔۔۔۔۔ ہم تو اکثر مسرتوں کے شہر جاتے آتے رہتے ہیں“ فریب نے مسکرا کر شاتم سے کہا ”ہمارے ساتھ جانے سے آپ کی بہت سی مشکلات کم ہو جائیں گی“

”شکریہ“ شاتم بولی۔

اب دھوکا اور فریب ان سے آگے آگے چل رہے تھے۔ وہ ان سے باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ کشت یاران کی باتوں سے محفوظ ہو رہا تھا۔ اس لیے اس نے راستہ بدلنے کی ضد بھی چھوڑ دی تھی۔ سب ان نئے ساتھیوں کے ملنے سے خوش تھے۔

وہ سب ایک دوسرے کے آگے پیچھے دشوار گزار راستے پر چلے جا رہے تھے کہ

ایک دم ہی

دھوکا اور فریب بائیں ہاتھ کے راستے پر مڑ گئے۔

”ارے۔۔۔۔۔“ کشت یار کے منہ سے بے اختیار نکلا۔۔۔۔۔“ آپ لوگ کدھر جا رہے ہیں۔ مسرتوں کے شہر کو یہ راستہ تو نہیں جاتا۔“

باقی سب بھی رک گئے۔ دھوکا اور فریب سیدھے راستے سے ہٹ کر دوسرے راستے پر جو چل دیئے تھے۔ کشت یار کی آواز پر فریب مسکرا کر بولا ”آپ نے کچھ کہا۔“

”ہاں“ واسقہ بولا۔۔۔۔۔“ آپ غلط طرف مڑ گئے ہیں۔ مسرتوں کے شہر کو یہ راستہ نہیں جاتا۔۔۔۔۔“

دھوکا پلٹا اور ان کے قریب آ کر خوبصورت انداز میں مسکرا کر بولا ”یہ کس نے کہا آپ سے“

”ہمارے رہنے کہا تھا کہ مسرتوں کے شہر کو یہی سیدھا راستہ جاتا ہے“ فیروں جلدی سے بولا۔

”اوہ اچھا۔۔۔۔۔ وہ رہبر۔ جو پہاڑ کی چوٹی پر رہتا ہے“ دھوکے نے معنی خیز انداز میں فریب کو دیکھا

”ہاں وہی۔۔۔۔۔ کشت یار بولا۔

دھوکا اور فریب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ سب ان کا منہ ٹکنے لگے۔

”بھئی۔۔۔۔۔“ فریب نے معصوم صورت بناتے ہوئے کہا ”ہم لوگ وہاں اکثر جاتے آتے رہتے ہیں۔ آج بھی ہم

مستروں کے شہر ہی جا رہے ہیں۔ یہ جورہر ہے نا۔ وہ جس کو بھی بھیجتا ہے اس کٹھن راستے پر جانے کی ضرورت۔۔۔۔۔۔؟“

”یہ بات تو ٹھیک ہے“ کشت یار فریب کے جل میں آ گیا ”وہ پتھر یلا اور ٹیڑھا میڑھا راستہ ہے۔ جبکہ یہ راستہ انتہائی خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔“

”بالکل۔۔۔۔۔۔“ دھوکا بولا۔ ”آپ چل کر تو دیکھیں بڑا آرام دہ سفر ہوگا۔“

”ہم تو اسی راستے سے جائیں گے۔“ کشت یار نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”واقعی جہاں تک نظر کام کرتی ہے راستہ صاف دکھائی دیتا ہے۔“

”صرف صاف ستھرا ہی نہیں صاحب“ دھوکا سینہ تان کر بولا ”اور بھی بہت سی سہولتیں ملیں گی آپ کو۔ جگہ جگہ آرام کرنے کے لیے جگہیں بنی ہوئی ہیں۔ درختوں کی گھنی اور مہکی چھاؤں ہے۔ اور ندی کا رم جھم کرتا چاندی ایسا شفاف پانی ہے“

”تو پھر چلو ساتھیو۔۔۔۔۔۔“ کشت یار نے کہا۔ راستے کی دلکشی کی جو تصویر دھوکے نے کھینچی تھی۔ اس نے سب کو مرعوب کر دیا۔ حتیٰ کہ فریدوں جو کچھ دیر پہلے راستہ بدلنے کی تجویز پر کشت یار سے الجھ پڑا تھا۔ وہ بھی خاموش ہو گیا۔

”آئیے۔۔۔۔۔۔“ فریب نے دل آویز مسکراہٹ سے سب کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر معصومیت لہرا رہی تھی۔ جسے وہ دلفریب بنانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ دھوکے نے بھی سب کو چلنے کے بہکانے والے دلفریب انداز میں کہا۔ کشت یار نے قدم اٹھایا۔ اور

سب ساتھی بھی اس کی تقلید میں اس کے پیچھے چلنے لگے۔ ایک تو دھوکے اور فریب کی دعوت ہی پر کشت یار تھی۔ اس پر پشتوں کے بوجھ بھی متقاضی تھے کہ وہ آسان اور آرام دہ راستے پر ہی سفر کریں۔

راستہ صاف ستھرا ہموار اور انتہائی خوبصورت تھا۔ سڑک خاصی چوڑی تھی۔ اس کے ایک طرف گھنے درختوں کے سلسلے تھے۔ پھولدار بنیلیں تھیں۔ اور خوش رنگ پھولوں کے تنخے کے تنخے تھے۔ دوسری طرف سبک خرام ندی بڑے ترنم کے ساتھ گنگناتی بہ رہی تھی جب ہوا کے جھونکے ندی پر سے ہو کر آتے تو ٹھنڈے اور میٹھے پانی کی پھوار سب کے چہروں کو چھو جاتی اب تو سب ہی خوش تھے۔ فریدوں کو افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے کشت یار کے متبادل راستہ اختیار کرنے کی خواہ مخواہ مخالفت کی تھی۔

”ہمارا یہی تا کام ہے“ فریب نے کہا ”ہم لوگوں کو اپنے جال میں پھنسا کر ادھر لے آتے ہیں اور جب وہ دلدل میں پھنستے ہیں۔ تو ہمیں بے حد خوشی ہوتی ہے“

”اور جب وہ دلدل میں غائب ہو جاتے ہیں۔ تو ہمیں اور بھی خوشی ہوتی ہے“ دھوکہ مسکرایا کشت یار واسقہ اور سب بچوں کی سٹی گم تھی۔ وہ آہستہ آہستہ دلدل میں دھنس رہے تھے۔

اچانک ہی فریدوں نے چھٹکارے کے لیے ہاتھ پاؤں چلانا شروع کئے۔ وہ بلند آواز سے دھوکے اور فریب کو کوس بھی رہا تھا۔

”کیا کر رہے ہو فریدوں۔۔۔۔۔۔“ کشت یار اس کی جدوجہد پر چیخ کر بولا ”بے وقوف کے کیا تم نہیں جانتے کہ دلدل میں ہاتھ پاؤں چلانے کا کوئی فائدہ نہیں الٹا تیزی سے دھنستے جاؤ گے۔۔۔۔۔۔“

”تو پھر ہم کیا کریں“ شاتم روتے ہوئے بولی۔

”ایک دوسرے کے موت کے منہ میں جانے کا تماشا دیکھو“ دھوکے نے ہنس کر کہا۔

”گیرو۔۔۔۔۔۔“ سیبہ نے روتے ہوئے بھائی کو پکارنے لگی۔

رمیلہ کے تو منہ سے آواز تک نہ نکل رہی تھی۔ چہرہ فق تھا۔ اور ہونٹ خشک۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کو دیکھ رہی تھی۔

”تم سب ہاتھ پاؤں چلانا چھوڑ دو۔۔۔۔۔۔“ کشت یار نے بلند آواز سے اپنے ساتھیوں کو متنبہ کیا ”دلدل میں دھنسنے سے دیر تک بچنے کا طریقہ صرف یہی ہے کہ ساری جدوجہد ترک کر دو۔۔۔۔۔۔“

”اس سے کیا فرق پڑے گا“ واسقہ بچوں سے بھی زیادہ خوفزدہ تھا۔ وہ ہکا کر باتیں کر رہا تھا۔

کشت یار خود بھی موت سے خوفزدہ تھا۔ پھر بھی اس نے حواس بجا رکھنے کی پوری کوشش کی تھی اس لیے ان کی تسلی کے لیے بولا۔

”ہم فریب اور دھوکے کی چال میں آگئے ہیں اب خدا ہی ہماری مدد کرے گا۔ ہو سکتا ہے کوئی راہ گیر ادھر سے گزرے اور ہمیں بچالے

اس کی بات پر

دھوکے اور فریب نے ملا جلا قہقہہ لگایا۔

سب پریشان سے پریشان تر ہوتے گئے۔

کشت یار کے کہنے پر انہوں نے اب ہاتھ پاؤں چلانا بند کر دیئے تھے۔ اور ان کے دھنسنے کی رفتار بلاشبہ آہستہ ہو گئی تھی۔ لیکن آہستہ سہی وہ دلدل میں دھنسنے تو جا رہے تھے۔

موت یقینی تھی۔

اور

اسے اتنا یقینی اور اتنا قریب پا کر سب کا حواس باختہ ہونا فطری تھا۔

یہاں جنگلات کا سلسلہ بڑا وسیع اور گھنا تھا۔ سورج کی روشنی کسی کسی جگہ لکیر اور دھبوں کی صورت میں پڑ رہی تھی۔ ورنہ اتنا اتنا تھا

اندھیرا تھا کہ یہ سب لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ بھی نہ پارہے تھے۔

سب دعائیں مانگ رہے تھے۔

اور

کسی شبی مدد کا انتظار کر رہے تھے۔

خوف و ہراس سے سب دم بخود تھے۔

اچانک ہی کشت یار کو ایک طرف سے روشنی آتی دکھائی دی۔ کوئی آدمی لائین لیے کنارے کنارے چلا آ رہا تھا۔

”مدد کرو۔۔۔۔۔ ہماری مدد کرو۔۔۔۔۔ ہم دلدل میں پھنس رہے ہیں۔۔۔۔۔“ کشت یار زور سے چلا یا۔ اب

وہ سینے تک دلدل میں دھنس چکا تھا۔

”کون؟“ آدمی نے لائین کی روشنی اونچی کی۔

”ہم لوگ ادھر ہیں۔۔۔۔۔“ سیہہ نے بے اختیار نہ چلائی۔۔۔۔۔“ دلدل میں دھنس رہے ہیں

”ہمیں بچالو۔۔۔۔۔“

”بچالو۔۔۔۔۔“

”بچالو۔۔۔۔۔“

واستقہ سمیت سب چلا چلا کر آدمی کو بلانے لگے۔

وہ آدمی چلتے چلتے ان کی طرف آ گیا۔

”مدد کر ہماری۔ ہمیں بچالو۔“ روتے ہوئے رومیلا اور شاتم بولیں۔

”تم۔۔۔۔۔ تم کون ہو۔۔۔۔۔“ آدمی نے لائین اونچی کر کے ان کے چہرے دیکھنے کی کوشش کی۔

”خدا دھوکے اور فریب کو غارت کرے“ سپہ نے کہا۔

”مدد مسکرائی اور بولی” وہ غارت ہو گئے۔۔۔۔۔“

”کیا مطلب؟“ تقریباً سب نے تجسس سے کہا۔

”دل دل کے اس پار سے جو آدمی لائین لے کر آیا تھا۔۔۔۔۔“ وہ بولی۔

”ہاں“

”وہ بہت چالاک اور فتنہ پرور آدمی ہے۔ اچھا کیا جو تم لوگوں نے سچ بولا اور اس نے تمہیں دل دل میں دھنسنے سے نہیں بچایا۔ اس شخص کا نام شر ہے اور وہ ایسے لوگوں کی کبھی مدد نہیں کرتا جو سچے ہوں اور کوئی نیک مقصد ان کے سامنے ہو۔ دھوکے اور فریب نے

جھوٹ کا سہارا لیا۔ وہ ان کو ساتھ تو لے گیا ہے لیکن اب ان کی شامت لائے گا“

”اچھا؟“

”ہاں وہ اب انہیں اپنا ٹوک بنا لے گا۔ اور وہی کچھ ان سے کروائے گا۔ جو وہ چاہتا ہے“ رمیلہ نے خوشی سے تالی بھائی اور پھر

بھائی سے لپٹ کر بولی ”فریدوں نے تم نے سچ بولا۔ اور اس سچ کی بدولت ہم سب بچ گئے“

”ہاں“ کشت یار نے بھی فریدوں کو داد دی۔ اسے اپنے رویے پر جو اس نے فریدوں کے سچ بولنے پر اختیار کیا تھا قدرے

ندامت محسوس ہوئی۔

تھوڑی دیر وہ کھڑے باتیں کرتے رہے۔

خدمت بھی ادھر ہی آ گئی۔ وہ بھی ایک اچھی اور نیک سیرت عورت تھی۔ سب نے اس کا بھی سکریہ ادا کیا۔

”اب جاؤ۔۔۔۔۔“ مدد نے انہیں راستہ بتانے کے بعد کہا ”تمہارا خدا حافظ ہو۔۔۔۔۔“

”شکریہ“ سب بولے۔

اور

پھر

خدا حافظ کہتے ہوئے اس راستے پر چل دیئے جو سیدھے راستے کو جاتا تھا سب مدد اور خدمت سے متاثر ہوئے تھے۔ کافی دیر وہ

انہیں کی باتیں کرتے رہے سب نے تہیہ کر لیا کہ وہ مدد اور خدمت جیسا بننے کی پوری کوشش کریں گے۔

رات اتر آئی تھی۔ ادھر چاند اپنی ناقص روشنی بکھیر رہا تھا چاندنی کا اجالا میلا میلا تھا۔

پھر بھی

وہ اس ناقص روشنی میں اپنے سفر پر رواں دواں تھے۔ تینوں لڑکیاں آگے آگے تھیں۔ فریدوں اور گروان کے پیچھے تھے۔ کشت یار سب سے پیچھے تھا۔ کیونکہ اسے واسقہ کے لیے بار بار رکنا پڑتا تھا۔

واسقہ

جو ابھی تک اپنے آپ کو دلدل کے خوف سے چھٹکارا نہیں دلا پایا تھا۔ اس کا حوصلہ ٹوٹ گیا تھا اور ہمت جو اب دے رہی تھی۔ ایک بار پھر اس پر جھنجھلاہٹ طاری تھی

اور

وہ اس وقت کو دل ہی دل میں کوس رہا تھا۔ جب اس سفر پر روانہ ہونے کے لیے تیار ہوا تھا۔ مہیب، صدف اور موہین کی خوش قسمتی پر اسے رشک آ رہا تھا۔ جنہوں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ اور اب چین و آرام سے گھروں میں تھیں۔ صدف تو بہت ہی عیش میں ہوگی۔ وہ اس کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔

”بھئی واسقہ ذرا تیز رفتاری پہ آ جاؤ“ کشت یار نے پلٹ کر دیکھا۔ واسقہ بے دلی اور ست روی سے چلا آ رہا تھا۔

”اس سے تیز مجھ سے نہیں چلا جاتا“ واسقہ پھینکا۔

”بھئی دیکھو تو۔ تم سے تو بچے اچھے ہیں۔ کیسے اچھلتے کودتے چلے جا رہے ہیں“

”جنہم میں جائیں بچے۔“ واسقہ بولا۔

کشت یار چپ چاپ کھڑا رہا۔ واسقہ برہم تھا۔ وہ بات زیادہ بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ قریب آیا تو کشت یار بھی چلنے لگا۔

دونوں نے پھر کوئی بات نہ کی۔ خاموشی سے سفر کرنے لگے۔

وہ دونوں سر جھائے چلے جا رہے تھے۔

کہ

اچانک ہی انہیں رمیلہ کی چیخ نما آواز سنائی دی۔

کیا ہوا۔۔۔۔۔ فریدوں اور گیر و دوڑے۔۔۔۔۔ لیکن انہوں نے دیکھا۔۔۔۔۔ تینوں لڑکیاں سر پٹ واپس بھاگی چلی آ رہی تھیں۔

کیا ہوا۔۔۔۔۔ کیا ہوا؟“ کشت یار نے قدم آگے بڑھائے۔

”وہ۔۔۔۔۔ وہ گھڑسوار۔۔۔۔۔“ رمیلہ ہکلائی

سنو آوازیں آ رہی ہیں۔۔۔۔۔“ سیبہ نے گھبرا کر کہا۔

کیسی آوازیں۔۔۔۔۔“ فریدوں نے رمیلہ کا کندھا ہلایا۔

”کچھ گھڑسوار ادھر آ رہے ہیں۔۔۔۔۔“ شاتم گھبرائی آواز میں بولی۔

”آ رہے ہیں تو کیا ہوا۔۔۔۔۔“ گیر و بولا ”کوئی گھڑسوار ہوں گے۔۔۔۔۔ ادھر سے گزر رہے ہوں گے“

”ان کے ہاتھوں میں تلواریں چمک رہی تھیں۔۔۔۔۔“ شاتم نے کہا۔

”اور نیزے بھی تھے۔۔۔۔۔“ سیبہ بولی۔

تم نے خود دیکھے“ کشت یار بولا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ وہ تلواریں لہراتے ہوئے آ رہے ہیں۔۔۔۔۔“ رمیلہ نے کہا۔

اوہ۔۔۔۔۔“ واستقہ کا رنگ ایک دم ہی پیلا پڑ گیا۔۔۔۔۔“ موت۔۔۔۔۔ موت۔۔۔۔۔“

”ڈرو نہیں واستقہ“ کشت یار خود بھی ڈر رہا تھا۔۔۔۔۔ لیکن واستقہ کو تسلی دینے کی کوشش کی۔۔۔۔۔“

”وہ۔۔۔۔۔ وہ ہمیں مار ڈالیں گے۔۔۔۔۔“ واستقہ ہکلا رہا تھا۔

اب گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں ان سب کو ہی سنائی دینے لگی تھیں۔ سب کے چہرے سپید پڑ گئے تھے۔۔۔۔۔ موت

کے منہ میں ایک بار جا چکے تھے۔ اس لیے کوفت و اذیت کا انہیں اندازہ تھا۔

آوازیں قریب آ رہی تھیں۔۔۔۔۔ پندرہ بیس گھڑسوار ادھر ہی آ رہے تھے۔ ان کے نیزوں کی انیاں چمک رہی تھیں۔ اور

تنگی تلواریں جب وہ گھماتے تو لگتا تھا بجلیاں چمک رہی ہیں

”یہ۔۔۔۔۔ یہ موت ہے۔ موت ہے“ واستقہ لٹے پاؤں بھاگا

”اسے پکڑو۔۔۔۔۔ کہاں بھاگ رہا ہے“ کشت یار نے کہا۔

فریدوں اور گیر وواستہ کو پکڑنے کے لیے دوڑے۔

لیکن

اس نے ان کے ہاتھ جھٹک دیئے۔۔۔۔۔ میں نہیں جاؤں گا تمہارے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گا۔۔۔۔۔ وہ ہمیں مار

ڈالیں گے“

”ایسے ہی مار ڈالیں گے“ گیر وونے جی کڑا کر کے کہا۔۔۔۔۔ حالانکہ مارے جانے کا خوف اسے بھی تھا

”ہاں۔۔۔۔۔ ایسے ہی مار ڈالیں گے۔۔۔۔۔ ان کے ہاتھوں میں تلواریں ہیں۔ میں نہیں مرنا چاہتا میں باز آ یا

مستروں کے شہر جانے سے مجھے کچھ ضرورت نہیں ہے۔

میں اس بوجھ کے ساتھ بھی جی لوں گا۔ مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔۔“

اس نے دونوں سے اپنے آپ کو چھڑایا اور سر پٹ دوڑتا واپس چلا گیا۔

کشت یار، گیر وونے روہانسی اور سہمی ہوئی آواز میں کہا ”واستہ نہیں رکا“

”وہ ہمیں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے“ فریدوں نے کہا۔

کشت یار کو اپنے ساتھی کے بچھڑ جانے کا افسوس بھی ہوا۔ لیکن سر پر جو مصیبت آئی کھڑی تھی اس نے اس وقت اسے کچھ زیادہ

سوچنے نہیں دیا۔

”وہ۔۔۔۔۔“ وہ قریب آ رہے ہیں ”رمیلہ نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیں فریدوں نے بڑھ کر اسے پٹالیا۔

شاتم اور سیہ نے گیر وکو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

اب گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں اور تلواروں کی جھنکار صاف طور پر سنائی دے رہی تھی۔ وہ لوگ منہ سے بھی عجیب و غریب

آوازیں نکال رہے تھے۔

سب کے دل ہول رہے تھے۔

رنگ سپید پڑ گئے تھے۔

ہونٹوں پر پیڑیاں جم رہی تھی

راستہ سنسان سے سنسان تر ہوتا جا رہا تھا۔ ہر طرف تاریکی کا دور دورہ تھا ویسے بھی راستہ درختوں سے ڈھکا تھا۔ اس لیے چاند کی ادھوری روشنی بھی نہیں آ رہی تھی کہیں کہیں جہاں درخت ذرا کم گھنیرے ہوتے وہاں چاندنی قدرے دھندلائی دھندلائی ہوتی۔۔۔۔۔۔ یہاں وہ ایک دوسرے کے سائے دیکھ سکتے تھے۔

”بہتر ہے کہ تم ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لو۔۔۔۔۔۔“ کشت یار نے بوجھل آواز میں کہا۔ اسے واسقہ کے جانے کا بے حد افسوس تھا۔ اسی وجہ سے مزاج میں تناؤ سا آ رہا تھا۔ ان پانچ بچوں کا ساتھ اک بوجھ لگ رہا تھا۔ آپوں آپ ان کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر آن پڑی تھی

بچے اندھیرے کے باوجود باتیں کرتے ہنستے مسکراتے لڑتے جھگڑتے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ وہ کشت یار سے نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ نہ ہی مانگ رہے تھے۔ پھر بھی کشت یار کبھی ان کے قبہتہوں سے جھلا جاتا کبھی لڑنے جھگڑنے سے تنگ آ جاتا۔ اب اس نے بچوں سے ہاتھ پکڑ کر چلنے کو کہا۔ تو بچوں کو بھی اس کا خیال آیا۔ فریدوں جو ابابا بولا۔ ”ہم ٹھیک ٹھاک ہیں۔ اور صحیح راستے پر چل رہے ہیں

”البتہ رات بہت گہری ہو گئی ہے۔“ شام نے کہا۔

”کیا یہ بہتر نہ تھا کہ ہم اس گھڑسوار ہی سے کہتے کہ رات گزارنے کے لیے ہمیں ٹھکانہ مہیا کر دے۔“ گیرو بولا۔

”یہ تو کشت یار کو کہنا چاہیے تھا“ فریدوں نے کہا۔

”ساری ذمہ داری تو کشت یار ہی کی ہے نا۔۔۔۔۔۔“ کشت یار بے حد تلخ لہجے میں بولا۔

”تم لوگ منہ سے کیوں نہ پھوٹے۔۔۔۔۔۔“

فریدوں نے گیرو کا ہاتھ دباتے ہوئے کشت یار کے لہجے کی تلخی کا احساس اسے دلا یا گیرو آہستگی سے بولا ”اے کیا ہو گیا؟“

”پتہ نہیں۔۔۔۔۔۔“ فریدوں نے کندھے اچکائے۔

”بھئی اسے ہم سے اس طرح باتیں نہیں کرنا چاہئیں“ گیرو بولا۔

”اس کی مرضی جیسے چاہے باتیں کرے۔ تم کون ہوتے ہو ایسا کہنے والے۔“

فریدوں نے سختی سے کہا۔

”ہم نے انہیں اپنا سردار بنا رکھا ہے۔۔۔۔۔۔۔“ گیروغصے سے بولا۔

”تو کرو تم ہی اس سے بات“ فریدوں نے تنگ آ کر کہا۔

”مجھے اس سے بات کرنا ہی پڑے گی“ گیرو ہٹ دھرمی سے بولا۔ ”آخر رات ہمیں کہیں رک کر ہی گزرنا ہے۔ بھوکے پیاسے رات بھر چلنے سے تو رہے۔۔۔۔۔۔۔“

”ہوں“ فریدوں نے صرف یہی آواز نکالی۔

گیرورخ پیچھے موڑ کر کشت یار سے مخاطب ہوا ”رات بھر چلنے کا ارادہ ہے کیا؟“

”بکو اس بند کرو۔۔۔۔۔۔۔“ کشت یار نے غصے سے کہا۔۔۔۔۔۔۔ ”میں پہلے ہی کچھ کم پریشان نہیں اوپر سے رات بسر کرنے کا انتظام اور کھانے پینے کی فکر بھی میں ہی کروں۔۔۔۔۔۔۔“

”تو۔۔۔۔۔۔۔“ گیرو حیرانگی سے بولا۔

”میں نے کہا نا چپ رہو۔۔۔۔۔۔۔“

”تو یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا۔۔۔۔۔۔۔“

”جنہم میں جائیں تمہارے مسئلے“

”یہ مسئلہ صرف ہمارا ہی نہیں تمہارا بھی ہے کشت یار۔۔۔۔۔۔۔“

کشت یار کا غصہ بھڑک اٹھا۔ وہ زور سے چلا یا۔۔۔۔۔۔۔ یہ میرا مسئلہ نہیں ہے میری اکیلی جان ہے۔ تم لوگ ہی میری جان کو آ رہے ہو۔۔۔۔۔۔۔ میں اکیلا ہوتا۔ تو اب تک کہاں کا کہاں پہنچ گیا ہوتا۔۔۔۔۔۔۔“

گیرو حیرت زدہ تھا۔۔۔۔۔۔۔

کشت یار بڑبڑ کر رہا تھا۔ بچوں پر اسے بے طرح غصہ آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ یہ بچے ساتھ نہ ہوتے تو وہ اب تک مسرتوں کے شہر پہنچ بھی چکا ہوتا۔ اس سے اسے بچے اک بہت بڑی مصیبت لگ رہے تھے۔

کشت یار کی بڑبڑاہٹ بچوں کی سمجھ میں تو نہ آئی۔ ہاں وہ اس بات سے کچھ خوفزدہ سے ضرور ہو گئے۔

گیرو کو سیہ نے بھی سرگوشی کے لہجے میں کہا ”کیوں اس کے منہ لگ رہے ہے۔ وہ غصے میں ہے“

”تو میں کیا کروں“ گیرو اب بھی جھٹلایا ہوا تھا۔

بچے ہیں کشت یار۔۔۔۔۔ اور پھر ادھر ہم لوگ لڑتے ہیں ادھر صلح بھی کر لیتے ہیں“
فریدوں بولا۔

”تم بڑوں کی طرح ہم سنجیدگی سے تھوڑا ہی لڑتے ہیں۔۔۔۔۔“ شاتم نے جھٹ سے بھائی کی طرف داری کی
”بالکل“ سیبہ بھی کہہ اٹھی۔

”بکو اس بند کرو۔۔۔۔۔“ انتہائی غصیلے لہجے میں کشت یار چلایا۔ اسے تو ان بچوں کی ہر بات پر غصہ آ رہا تھا۔
بچے ڈر گئے۔ گیرو نے سیبہ کو ٹھوکا مار کر خاموش رہنے کو کہا۔ لیکن اندھیرے میں ٹھوکا سیبہ کی بجائے رمیلہ کو لگ گیا۔

وہ

زور سے چیخی اور لڑنے کے انداز میں بولی ”کس نے مجھے مارا ہے۔ یہ کیا بد تمیزی ہے۔۔۔۔۔“

کشت یار بیزار ہو گیا۔ وہ چند قدم پرے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ بچے اس کے لیے گام گام پر مصیبت کھڑی کر رہے تھے۔

بجلی چمکتی تو سب نے دیکھا کہ کشت یار ان سے ہٹ کر کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا ہے اور اس نے ان سب سے منہ بھی پھیر رکھا ہے۔

اس بار

وہ

پھر

سہم گئے۔

”ایسا نہ ہو کشت یار ہمیں اس ویرانے اور اندھیرے میں چھوڑ کر غائب ہو جائے“

فریدوں نے گیرو کے کان میں ہولے سے کہا۔

”ہاں کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔“

”بھئی ان لڑکیوں کو سمجھاؤ۔۔۔۔۔ اب لڑیں جھگڑیں نہیں۔۔۔۔۔“

”تم اپنی بہنوں کو سمجھاؤ۔۔۔۔۔ میں اپنی بہن کو سمجھاتا ہوں۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے“

گیرو نے سیبہ کو پکارا وہ قریب آئی۔ تو اس کا ہاتھ تھام کر اس نے موقع کی مناسبت اور نزاکت سے اسے آگاہ کیا۔۔۔۔۔“

”کوئی ٹھکانہ ڈھونڈوں، ہو سکتا ہے اردگرد کوئی مکان نظر آ جائے۔ آخر رات تو بسر کرنی ہے۔۔۔۔۔ میں جا کر دیکھتا ہوں۔۔۔۔۔“

”اور ہم۔۔۔۔۔“ وہ روہانے ہو گئے

”سب کو ایسے موسم میں کہاں گھسٹینا پھروں گا۔ تم سب ادھر ہی رکو۔ میں جا کر جگہ تلاش کرتا ہوں۔ کوئی ٹھکانہ مل گیا تو تمہیں آ کر لے جاؤں گا“

”گیرو۔۔۔۔۔“ سیبہ نے بھائی کا کندھا تھام لیا۔

”فریدوں“ شاتم اور رمیلہ بھی بھائی سے لپٹ گئیں۔

”میں ابھی جا رہا ہوں کہیں پھر بارش نہ آ جائے۔۔۔۔۔“ کشت یار نے جانے کو قدم اٹھایا۔ ”کشت یار جلدی آ جانا۔۔۔۔۔“ زمیلی بیچارگی سے بولی۔

”کشت یار کو خوفزدہ پنگی پر ترس آ گیا۔ رک کر بولا۔ ”میں تم لوگوں کی خاطر ہی جا رہا ہوں۔ جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔ سب ادھر ہی رہنا“

اس کے لہجے کی تبدیلی سب نے محسوس کی۔ کچھ سہارا ملا۔ سب ایک دوسرے کے قریب قریب کھڑے رہے۔

کشت یار قدم اٹھاتا وہاں سے چل دیا۔

وہ ادھر ادھر دیکھتا جا رہا تھا کہ کہیں کوئی مکان نظر آ جائے۔ تو وہ رات بسر کرنے کے لیے ٹھکانہ بنا لے۔ اور کچھ کھانے پینے کے لیے بھی حاصل کر لے۔

وہ کافی دور نکل گیا۔

دائیں مڑ

بائیں دیکھا

اسے جدھر بھی کچھ روشنی دکھائی دیتی وہ ادھر ہی چل پڑتا۔

کافی دیر بعد

اسے

وہ بھی مسکرانے لگا۔

پھر

وہ بولا۔ ”اب میں سوچتا ہوں کہ ان بچوں کو ساتھ لے لوں۔ مگر۔۔۔۔۔۔“ وہ کہتے ہوئے ہچکچایا کہ اس نے بچوں کو ساتھ

لینے کا فیصلہ ترک کر دیا ہے۔

”مگر کیا“ عورت نے پوچھا۔

تو

وہ جلدی سے بولا۔ ”مگر اب میں بچوں کو ساتھ لے کر نہیں جا سکتا۔ اسی لیے میں انہیں چھوڑ آیا ہوں۔“

عورت پینٹر ابدل کر بولی۔ ”تم شکل سے بیوقوف ہرگز نہیں لگتے۔ تم جو فیصلہ کرتے ہو۔ وہ ذہانت سے بھرپور ہوتا ہے۔

کشت یار ہبہ پا کر بولا ”میں واقعی ان بچوں کو چھوڑ آیا ہوں“

”تم جیسے زیرک ہوشیار اور ذہین نوجوان سے ایسی ہی توقع کرنی چاہیے۔ دیکھو نا تمہارا فیصلہ کتنا اچھا ہے۔ وہ تو بچے ہیں۔ جیسے

آئے ہیں۔ ویسے ہی واپس لوٹ جائیں گے تم انہیں ساتھ کیوں لے جاؤ۔ وہ تمہارے اپنے بچے تھوڑے ہیں۔ کل کلاں کسی کو کوئی

نقصان پہنچے یا ہرج مرج ہو جائے۔ تو ان کے والدین کو تم کیا جواب دو گے۔

تمہارا فیصلہ بالکل ٹھیک ہے۔ تم ہر فیصلہ عقلمندی سے جو کرتے ہو۔۔۔۔۔۔“ عورت اس کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔

”میں حیران ہوں کہ دنیا میں تم جیسے انسان بھی بستے ہیں۔ جو مشکلات کو اتنی خوش اسلوبی سے رفع کر دیتے ہیں۔ تم صرف ذہین

نک بہادر اور ذمہ داری ہی نہیں معاملہ فہم بھی ہو۔۔۔۔۔۔“

کشت یار کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ خوشی سے پھول کر کپا ہور ہاتھا۔ سرفخر و غرور سے اونچا ہور ہاتھا۔ وہ چاہتا تھا۔ عورت اس کی

تعریفوں کے پل بانہستی رہے اور وہ سنتا چلا جائے۔

”تم نے اتنے گر کہاں سے سیکھے۔۔۔۔۔۔“ عورت دلفریبی سے مسکرا کر بولی۔

”وہ سینہ تان کر بولا۔ ”یہ تو مجھ میں پیدائشی وصف ہیں۔۔۔۔۔۔ میں تو۔۔۔۔۔۔“

وہ بات پوری نہ کر پایا۔

اس کا پاؤں پھسل گیا تھا۔ اور وہ پگڈنڈی کی ڈھلان سے نیچے گندے پانی کے جوہڑ میں جا گرا تھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔۔ اس شہر کے لوگ بھی بہت اچھے ہیں۔ وہ دن بھر محنت سے اپنے کام کرتے ہیں۔ کوشش اور لگن سے فرانس انجام دیتے ہیں۔ اسی لیے شام کو یہاں میلہ لگتا ہے تاکہ یہ لوگ اپنی ٹکان اتار کر زندگی کی دلچسپیوں کا مزہ لیں اور محنت کا ثمر حاصل کریں۔۔۔۔۔۔“

”بہت خوب“

اب ملکہ کی رتھ نظر آنے لگی تھی۔ بے حد شاندار رتھ تھی۔ رتھ سونے اور چاندی کی بنی تھی اور اس میں سچے موتی اور پتھر لگے تھے۔ بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ گدی ملی نشست پر ملکہ اک شان سے بیٹھی تھی۔ اس نے شاہانہ لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر شاہی تاج چمک رہا تھا۔ گلے میں چمکتی مالائین تھیں۔ جدھر سے رتھ گزرتی تھی لوگ ہاتھ اٹھا اٹھا کر ملکہ کو تعظیم دیتے تھے۔

اور

ملکہ کے اشارے پر اس کے قدموں کے قریب بیٹھی لونڈیاں اور غلام جنہوں نے خود بھی رنگین اور چمکیلے لباس زیب تن کر رکھے تھے چیزوں سے بھرے تھیلے لوگوں کو دیتے جا رہے تھے۔

بچے کشت یار کے پہلو میں آن کھڑے ہوئے اور شوق و تجسس سے ملکہ کی رتھ کے قریب سے گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔ رتھ ان کے قریب سے گزری تو باقی لوگوں کی طرح انہوں نے بھی ہاتھ اٹھا کر ملکہ کو تعظیم دی

اور

ملکہ نے انہیں بھی انعام سے نوازا۔

اپنے اپنے تھیلے لے کر وہ ایک طرف ہو گئے۔ ان تھیلوں میں بہت سی چیزیں تھیں۔ خوبصورت اور بیش قیمت کچھ لفافوں میں کھانے پینے کا سامان تھا۔

سب چونکہ دوپہر سے بھوکے تھے۔ اس لیے اور چیزیں تو الگ رکھ دیں۔ لذیذ اور مزیدار چیزیں چنارے لے لے کر کھانے لگے۔

”بہت مزے کی چیزیں ہیں۔“

”اتنی مزیدار چیزیں ہم نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں کھائیں۔۔۔۔۔۔“

”پیٹ بھر گیا ہے۔ لیکن نظر نہیں بھری۔ جی چاہتا ہے کھاتے ہی جائیں“

”کیا ہے“

”میراجی سیہ اور گيرو کے بغیر جانے کو نہیں چاہ رہا۔ دل کہتا ہے وہ ابھی کہیں سے آ جائیں گے“

”یہ خوش فہمی ہے بیٹا“ کشت یار نے اسے پیار سے سمجھایا۔۔۔۔۔۔ وہ دانستہ کہیں چھپ گئے ہیں۔ فراغت کے شہر نے انہیں

الجھالیا ہے۔ اب وہ باہر نہیں آئیں گے“

”اب تو شاید لکھ کے آدمی انہیں پکڑ کر بھی لے گئے ہوں“ فریدوں نے گہری سانس چھوڑی۔

شاتم رونے لگی۔

”چلیے کشت یار چچا“ فریدوں بولا۔

”چلیے“ رمیلہ نے بھی بھائی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

سب ملول و دل گرفتہ تھے۔

لیکن

اب یہاں ٹھہرنا بیکار تھا۔

شاتم بار بار اپنی الٹی ہتھیلی سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ سیہ کے یوں بچھڑ جانے کا اسے بہت دکھ پہنچا تھا۔ کچھ یہی حال فریدوں کا

تھا۔ وہ بھی گيرو کے چلے جانے سے افسردہ اور ملول تھا۔

”فراغت کا شہر۔ دونوں بہن بھائیوں کو نگل گیا“ کشت یار کرب و اذیت سے بھرے لہجے میں بولا۔

”ہاں کشت یار چچا۔۔۔۔۔۔“ رمیلہ رو پڑی۔

”ہم کتنے لوگ سفر روانہ ہوئے تھے“ فریدوں افسردگی سے بولا۔ ”لیکن ہمارے ساتھی ساتھ چھوڑتے چلے گئے۔“

”سیہ اور گيرو نے حد ہی کر دی۔ اب جب ہم منزل کے اتنے قریب آ چکے تھے وہ ہم سے بچھڑ گئے۔“ کشت یار نے ٹھنڈی

سانس چھوڑی۔

”اب ان کا کیا ہوگا“ رمیلہ رو ہنسی آواز میں بولی۔

”وہی ہوگا۔ جو اجنبی نے بتایا تھا“ کشت یار نے کہا ”وہ لوگ پکڑے جائیں گے اور ملکہ انہیں غلام بنا لے گی۔“

اور

اسے یوں لگا جیسے اس کے اندر بہادری کا خون دوڑنے لگا ہے۔

وہ اک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا

کشت یار نے حیرانگی سے اسے دیکھا شاتم اور ررمیلہ گھبرا گئی۔

”کشت یار چچا“ فریدوں مستحکم آواز میں بولا۔

”کیا ہے بیٹے“ کشت یار کا لہجہ دھیما تھا۔

”ہم اس طرح کب تک بیٹھے رہیں گے۔ ہمیں اس مصیبت کا آگے بڑھ کر بہادری سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ مصیبت آئی اسی لیے ہے کہ ہمیں راہ راست سے بھٹکا دے۔“

کشت یار اس کے لب و لہجے سے حیران سا ہوا۔

لیکن جب فریدوں نے دوبارہ یہی بات کہی تو وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہوا۔ اسی احساس سے مغلوب ہو کر بولا ”تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔۔۔۔ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ تم صحیح کہتے ہو۔ بالکل صحیح کہتے ہو۔۔۔۔۔۔“

وہ اک عزم اور نئے حوصلے سے بولا۔

”ہاں کشت یار چچا۔۔۔۔۔۔“ فریدوں نے کہا ”ہم مصیبت کا سامنا اور مقابلہ نہیں کریں گے تو اسے ختم کرنے کا طریقہ کیسے آئے گا۔۔۔۔۔۔“

پھر

اس نے شاتم اور ررمیلہ سے کہا ”اٹھو تم دونوں بھی۔ ہم پوری قوت عزم اور ہمت سے اس مصیبت کا مقابلہ کریں گے۔۔۔۔۔۔“ فریدوں نے آگے قدم بڑھایا۔

کشت یار شاتم اور ررمیلہ کا ہاتھ پکڑے پکڑے آگے بڑھا۔

”ٹھہرو۔۔۔۔۔۔“ ررمیلہ نے پرہمت لہجے میں کہا۔

”کیا ہے“ کشت یار بولا۔

”یہ دیکھو۔۔۔۔۔۔“ اس نے جھکتے ہوئے کہا۔ پھر اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ تو اس کے ہاتھ میں چھڑی نما سوکھے درخت کی ٹہنی تھی۔

”بالکل۔۔۔۔۔۔ میرے پیٹ میں تو جو ہے ناچ رہے ہیں۔۔۔۔۔۔“ فریدوں بولا۔

”ہائے مجھے تو گیر واور سیہہ یاد آ رہے ہیں“ شاتم بولی ”کم بختوں نے کس منزل پہ آ کے ساتھ چھوڑ دیا۔۔۔۔۔۔“

”پیاری بچی“ کشت یار نے اس کے کندھے کو تھپتھپایا۔۔۔۔۔۔“ وہ بزدلی دکھا گئے۔ اب انہیں یاد کر کے ملول ہونے سے

کوئی فائدہ نہیں۔۔۔۔۔۔“

وہ باتیں کر رہی رہے تھے کہ وہی آدمی دروازے میں آتے ہوئے بولا ”آئیے آپ لوگ منہ ہاتھ دھولیں۔۔۔۔۔۔ تازہ دم

ہو کر ناشتہ کریں“

وہ ٹھنڈے اور میٹھے پانی سے ہاتھ منہ دھو کر واقعی تازہ دم ہو گئے۔ ناشتہ تیار تھا۔ اس کی خوشگوار مہک سارے گھر میں پھیلی تھی۔

اور ان کی اشتہا کو تیز کر رہی تھی۔

جب وہ سب ناشتے کے لیے بڑی سی لکڑی کی میز کے گرد بیٹھے ان کا جی چاہ رہا تھا کہ مزے مزے کی چیزوں پر جھپٹ پڑیں۔

لیکن

اب وہ سب سلجھے ہوئے لوگ تھے۔ بچے تیز دار اور شائستہ بن چکے تھے۔ کشت یار بھی وضع داری نبھانا جان گیا تھا۔ وہ یکسر بدل

چکا تھا۔ چہرے مہرے سے اب وہ ظالم اور عیار نہیں۔ بلکہ بڑا محترم اور قابل قدر آدمی دکھائی دیتا تھا۔

”شروع کیجئے“ میزبان نے گرم گرم دودھ کے پیالے بھی سب کو پیش کئے۔ اس کی بیوی بھی آگئی تھی۔ جو بڑی پیاری صاف

ستھری اور خوش گو خاتون تھی۔ وہ بڑے اصرار سے سب کا ناشتے میں رکھی چیزیں پیش کرنے لگی۔

”یہاں سے مسرتواں کا شہراب کتنی دور ہوگا“ رمیلہ انڈوں کا حلوہ کھاتے ہوئے بولی۔

”آپ لوگ واقعی باہمت اور پر عزم ہیں“ میزبان نے کہا۔

”خدا کرے ہم منزل تک پہنچ جائیں۔ اور اپنی پشتوں پر لدے ان بوجھوں سے نجات پالیں“ کشت یار فرانی گوشت کا ٹکڑہ

اٹھاتے ہوئے بولا

”یہ آخری پڑاؤ ہے اس راستے کا“ خاتون مسکرائی ”سمجھے کہ آپ منزل پر پہنچ ہی گئے“

بچے بے حد خوش نظر آنے لگے۔ کشت یار انہیں کمال محبت سے دیکھنے لگا۔

ناشتے کے بعد ان لوگوں نے دوسرے کمرے میں جا کر آرام کیا۔ اہل خانہ نے ان کے لیے صاف ستھرے بستر لگا دیئے تھے۔

”ہم سے انجانے میں غلطی ہو گئی ہے تو ہم معافی چاہتے ہیں“ فریدوں نے انکساری سے کہا۔

”کیا آپ ہمیں اس دروازے سے شہر کے اندر جانے دیں گے؟“ شاتم تمیز سے بولی۔

”یہ سرتوں کے شہر ہی کا دروازہ ہے نا“ رمیلہ نے معصوم انداز میں سوال کیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔۔“ وہ شخص جیسے غرایا۔۔۔۔۔۔“ لیکن میں ہر شخص کو سرتوں کے شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے

سکتا۔“

چاروں نے مایوس کن پریشانی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ یہ کیا ہو گیا تھا۔ وہ سرتوں کے شہر کے دروازے تک پہنچ کر بھی اندر نہ

جا پار ہے تھے۔

”محترم شخص۔۔۔۔۔۔“ کشت یار نے قدرے توقف کے بعد کہا ”کیا اندر داخل ہونے کے لیے ہمیں کسی خاص شخص سے

اجازت لینا ہوگی؟“

”نہیں“ وہ سختی سے بولا۔

”تو پھر۔۔۔۔۔۔“ آپ ہمیں اندر داخل کیوں نہیں ہونے دے رہے“ ایک دم ہی شاتم کہہ اٹھی۔ رمیلہ معصومیت سے بولی

”ہم چاروں کا اندر جانے دیں نا۔۔۔۔۔۔ ہم بہت دور سے آئے ہیں“

”نہیں۔۔۔۔۔۔“ وہ اسی سخت لہجے میں بولا۔۔۔۔۔۔“ تم سب اجنبی ہو۔ اور میں اجنبیوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں

دوں گا۔۔۔۔۔۔“

”ہمیں نہ روکنے۔۔۔۔۔۔“

”ہمیں اندر جانے دیں“

”ہم بہت دور سے آئے ہیں۔“

”ہماری منزل یہی ہے“

”ہم نے ضرور اندر جانا ہے“

”خدا کے لیے ہمیں نہ روکنے“

وہ سب دربان سے استدعا کر رہے تھے۔

لیکن

دربان ان کی سنی ان سنی کرتے ہوئے دوسری طرف چل دیا۔

وہ

سب

تھک ہار کر

بے انتہا مایوس ہو کر پتھروں کے اوپر بیٹھ گئے۔ وہ اپنے سر جھکائے ہوئے تھے اور اتنے پریشان تھے کہ انہیں کچھ سوجھ بوجھ ہی نہ رہا تھا۔

بھوک پیاس سے الگ برا حال تھا۔

وہ جانے کتنی دیر اسی طرح خاموش بیٹھے رہے کہ اچانک ہی ایک نرم و لطیف آواز نے انہیں چونکا دیا

”کون ہو تم لوگ اور اس طرح سر جھکائے کیوں بیٹھے ہو؟“

سب نے سر اٹھائے اور گرد موڑ کر پیچھے دیکھا۔

سادہ لیکن انتہائی پروقار لباس میں ایک معزز بزرگ وہاں کھڑا تھا۔ جس کی حیرت انگیز حد تک شکل اس بزرگ سے ملتی تھی۔ جس نے

ان کے شہر میں آکر ان کے گناہوں کے بوجھ ان کی کمروں پر نمودار کئے تھے۔

بے اختیار سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”آپ۔۔۔۔۔ وہ؟۔۔۔۔۔ آ۔۔۔۔۔ پ۔۔۔۔۔ وہ سب حیرت کا شکار تھے ”جو

ہمارے۔۔۔۔۔ شہر۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ میرے بچو۔۔۔۔۔“ بزرگ نے بڑی شفقت اور محبت سے کہا۔ ان کی ادھوری بات سے بزرگ ان کا

مفہوم سمجھ گیا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور کشت یار سے ہاتھ ملانے کے بعد بچوں کو پیار کرتے ہوئے بولا۔۔۔۔۔ وہ میرا بھائی تھی۔ جو

آپ کے شہر گیا

”ہم دراصل۔۔۔۔۔“ کشت یار نے شرمندگی سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

اس وقت جاگے۔ جب میزبان انہیں رہنما کے پاس لے جانے کے لیے کمرے میں آ گیا۔
شام اتر رہی تھی۔ اس کے دھندلکے پھیل رہے تھے۔ فضا میں نمی اور مہک گھل گئی تھی۔

وہ سب رہنما کے پاس جانے کے لیے تیار تھا۔ ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ تجسس اور اشتیاق ان کے چہروں سے
ہویدا تھا۔ وہ آج شام اپنی پشتوں پر لدے گناہوں کے بوجھوں سے نجات پانے والے تھے۔

وہ میزبان کے ساتھ رہنما کی رہائش گاہ کی طرف چل دیئے۔ راستے میں انہوں نے بہت کم باتیں کیں۔ وہ اپنے آپ کو آنے
والے لمحات کے لیے تیار کر رہے تھے۔ جن میں انہیں سر تیں ملنے والی تھیں۔

رہنما کی رہائش گاہ شہر کے غربی حصے میں تھی۔ بہت بڑی عمارت تھی۔ جس میں روشنی کا بہترین انتظام تھا۔ اونچے داخلی دروازے
کے آگے وسیع و عریض صحن تھا۔ اور اس صحن کے چاروں طرف رہائشی کمرے تھے۔

اس وقت رہنما صحن ہی میں موجود تھا۔ بے شمار لوگ صحن میں تھے۔ سامنے ایک قدرے اونچے چبوترے پر رہنما کھڑا تقریر کر رہا
تھا۔ لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ اور سر جھکائے بڑی عقیدت و احترام سے رہنما کی باتیں سن رہے تھے۔
وہ کہہ رہا تھا۔

”لوگو۔۔۔۔۔ ہمیشہ سچ بولو بڈی سے بچو۔۔۔۔۔ جھوٹ سے دامن بچاؤ۔ شر نہ پھیلاؤ۔۔۔۔۔ اللہ نے دنیا بڑی
خوبصورت بنائی ہے۔ اس کی خوبصورتی کو قائم رکھو۔ بچوں سے پیار کرو۔ بزرگوں کا ادب کرو۔ دھوکے فریب اور ریا کاری کے قریب
بھی نہ پھینکو۔ ایک دوسرے کی مدد میں ہمیشہ پیش پیش رہو۔ علم حاصل کرو۔ اور اس کی روشنی پر محبت پھیلاؤ۔
میزبان ان چاروں کو لے کر رہنما کے قریب پہنچ گیا۔ رہنما تقریر ختم کرتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہوا۔
”آؤ میرے دوستو“ بزرگ نے بڑی محبت سے کہا۔

چاروں اس کے سامنے آ گئے۔۔۔۔۔ بزرگ نے ایک ہاتھ کشت یار کی طرف بڑھایا دوسرا فریدوں کی طرف۔ پھر شام
اور رو میلا کو اپنے سامنے کھڑے ہونے کا کہتے ہوئے اپنے ہاتھوں میں پکڑے کشت یار اور فریدوں کے ہاتھ اوپر اٹھائے۔
”میرے ساتھیو! اس نے مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

لوگ سر اٹھا اٹھا کر راہنما اور ان چاروں کو دیکھنے لگے جن کی پشتوں پر کب اٹھے ہوئے تھے ”ہمارے نئے دوست اور ساتھی
ہیں۔۔۔۔۔“ رہنما نے قدرے توقف کے بعد لوگوں سے کہا ”یہ اپنے شہر سے میلوں کا پر صعوبت اور کٹھن راستہ طے کر کے

